Regd. No. K-62

★ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

آلِ جموں و کشمیر جمعیتِ محبانِ اولیا کا

ماہنامہ

اولیا

شعبۂ نشر و اشاعت آلِ جموں و کشمیر جمعیتِ محبانِ اولیا

CC-0. KRC Collection, Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

HELP/22/32

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

REGISTERED NO 62

آل جموں و کشمیر جمعیت محبانِ اولیاء کا ماہنامہ

نقیب الاولیاء نمبر

جلد ۳ ربیع الثانی جمادی الاول ۱۳۹۸ھ اپریل ۱۹۷۸ء شمارہ ۴

مجلس ادارت

سرپرست :- سید نور الدین گیلانی
ریاضت ٹینگ۔ خانیار سرینگر
میر حبیب اللہ کاملی
پیرزادہ بشیر احمد ادیبی
پیرزادہ بدر الدین
سید کمال الدین کاملی
مفتی جلال الدین

پبلشر :- مجلس ادارت
مطبوعہ :- نیو کشمیر پریس سرینگر

مضامین

گذارش	مفتی جلال الدین	۲
ختم نبوت	علامہ اقبال رح	۴
ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر	علامہ اقبال رح	۲۶
یہ غلو عقیدت ہے یا شعور حقیقت	مفتی جلال الدین	۴۴
مقام اقبال	مولانا محمد الیاس کاندھلوی	۴۵
فریاد امت	علامہ اقبال رح	۴۷

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

زوار نمبر

الاولیاء

جلد ۳ اپریل ۱۹۷۸ء مطابق ربیع الثانی و جمادی الاول ۱۳۹۸ھ شمارہ نمبر ۴

گذارش

بسم اللہ تعالیٰ:-

مفکر اسلام، شاعر قرآن، مفسر ختم نبوت، ترجمان حقیقت، زبان حق، حضرت علامہ اقبال رح کو اپریل ۱۹۳۸ء سے اس اپریل ۱۹۷۸ء تک دنیا کو چھوڑ کر "حضوری" میں پہنچے ہوئے پورے چالیس سال کا عرصہ گذر گیا۔ گو ان کے الہامی کلام کی اہمیت اور اعلیٰ قدر و قیمت ان کی موجودگی میں ہی محسوس ہونے لگی تھی۔ بلکہ اسکی عظمت دلوں پر چھانے لگی تھی۔ ان کے بعد ان چالیس سال کی مدت میں ان کے ہی فرمودہ:-

"اے بسا آرزو کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بربست و چشم ما کشاد"

کی سچائی میں وہ انتقال فرمانے کے بعد "زاد" پیدا ہوئے ہیں۔ پیدا تو اپنے کلام بلند مقام میں ہوئے ہیں۔ اور ہر طرف ہر سمت دیکھے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کی سمجھ پر تعصب یا غلط فہمی کا پردہ آج تک پڑا ہوا تھا۔ ان کا پردہ بھی اب چاک ہونے لگا ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب کے کلام کو انسانیت کے وسیع سے وسیع تر مفاد کے نکتہ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ پاکستان کا کیا کہنا ہندوستان میں بھی جگہ جگہ اقبال سیمنار قومی سطح پر ہوئے۔ نہیں۔ بلکہ بین الاقوامی سیمنار بھی منعقد کئے گئے۔ اور دنیا کے مختلف ممالک سے بڑے بڑے عالم فاضل، ادیب، ماہر لوگ اقبالیات پر بولتے پڑھتے لکھتے رہے اقبالیات پر بے شمار کتابیں، لاتعداد مقالے، جرائد اور رسالوں کے اقبال نمبر شائع ہوئے حضرت اقبال علیہ الرحمہ نے فی الحقیقت سچ کہا

"چشم خود بربست و چشم ما کشاد"

اس جہان سے جسمانی رخصت ہونے پر اپنی آنکھیں بند کر دیں۔ لیکن اپنے کلام سے مردہ لوگوں اور قوموں کی آنکھیں کھول دیں۔ اس لئے حضور حق میں اس حضرت کے خلاف اسرافیل نے شکایت کی کہ یہ بندہ اپنے پیام و کلام کے صور کی آواز سے مردوں کو جو زندہ کر رہا ہے۔ وقت سے پہلے

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

قیامت بپا کر رہا ہے۔ اس طرح میرے سپرد کام
میں دخیل ہو رہا ہے ؎

"یا مرا عزل کن از ین خدمت
یا ادرا کار دیگرے فرما"

الغرض اس جوش و خروش، جذبہ و جنون سے
جس کا اقبالیات کے سمجھنے سمجھانے کے بارے میں
مظاہرہ ہو رہا ہے۔ یہی ظاہر ہے۔ کہ اس باعث
خوشنودی و آبادی، "اقبال و حسن مآل" کا
شاعر کی وہ پیشینگوئیاں حرف حرف لفظاً و معناً
صحیح اور سچ ثابت ہو رہی ہیں۔ جو موصوف نے
اپنی شاعری کے بارے میں کی تھیں۔ اور جناب کا
زبان حق ہونا نہ صرف علم الیقین اور حق الیقین بن رہا
ہے۔ اونچے اونچے قد کے بڑے بڑے جرائد اور
رسایل نے آب و تاب اور قدر و قیمت والے اقبال نمبر نکالے
جن میں نامور اہل فضل جوہر لوں نے کلام اقبال کے اپنے
عقیدی جواہر نمائش میں پیش کئے ہیں۔ ان کے
ہول سے پیلہ ورجہ یدہ "الاولیاء" کا اس ارادہ
میں دم نہ گھٹے تو اور کیا ہو؟ کہ اس کا بھی ایک
اقبال نمبر شایع ہو۔ اس ہول و خجل سے جو
پہنائے دریا (دیگر رسالے) سے قطرہ (الاولیاء)
کو لاحق ہوا تھا۔ اس خیال کو عملی شکل دینا محال تھا لیکن
اس حضرت حق نے جو بفرمان نبی رحمت یُنظرُ الی
قلوبکم دلوں کو دیکھتا ہے۔ "الاولیاء" کے
خلوص دل کو دیکھا اور جانچا۔ اس لئے صلہ و ثواب میں
تقدیر میں پہلے سے لکھے ہوئے اقبال نمبر کے لئے
اس سامان کا تدبیر کیا۔ جو کسی بھی بڑے بڑے اور
مشہور سے مشہور جریدہ یا رسالہ کو نصیب نہیں ہوا
اور اہل امتیاز کے وہ اسباب مہیا کئے — جو
اوروں کے لئے ناپید ہیں:۔

اس نعمہ کی تفسیر یہ ہے۔ کہ اوروں نے تو اہل قلم
حضرات کے "تخمین و ظن" متعلق کلام اقبال نشر
کئے۔ جو بفرمودۂ اقبال "سراپا حجاب" ہیں رسالہ
"الاولیاء" وہی کلام اقبال شایع کر رہا ہے — جو
کئی قرون رفتہ سے گم اور نایاب ہوا ہے۔ اور جس کی
تلاش سخت کوشی و سخت جانی سے کی جا رہی ہے
جسکی لذت مطالعہ کی یاد ستا رہی ہے اور تڑپ کے
ساتھ تمنا کی جاتی ہے۔ کہ کہیں سے وہ کلام پھر دستیاب
ہو۔ اور دین کے علم و عمل کے سدھار میں مدد فرما ہو
اور وہ کلام ہے۔ حضرت اقبال کے "دو معرکۃ الآرا
مقالے" ایک ہے بعنوان ملت بیضا پر عمرانی نظر۔ جو دراصل
انگریزی زبان میں علیگڈھ کے طلبا و اساتذہ کے سامنے
سنہ ۱۹۱۳ء میں دیا ہوا لیکچر ہے۔ جس کا ترجمہ میدان
ترجمہ کے سپہ سالار مرحوم مولانا ظفر علی خان نے
کیا ہے۔ اسوجہ سے ترجمہ بھی تبرک ہے۔ اور دوسرا
مقالہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی توضیح و تشریح اسلامی
توحید و حکمت ختم نبوت کی جو موصوف نے پنڈت
جواہر لال نہرو کے اعتراض کے جواب میں لکھا ہے
جس نے نہ صرف معترضین کے ہوش ٹھکانے کر رکھدئے
بلکہ نوجوانوں کے میلان بطرف احمدیت کا جنازہ نکالکر
اس میلان کو اتنا گہرا دفنایا۔ کہ بقول (بقیہ صفحہ)

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

ختمِ نبوّت

از۔ علامہ اقبال رح

مترجمہ میر حسن الدین بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ)

ماڈرن ریویو کلکتہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تین مضامین شایع ہونے کے بعد سے مجھے اکثر مسلمانوں نے جو مختلف مذہبی و سیاسی مسلک رکھتے ہیں۔ متعدد خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کی خواہش ہے۔ کہ میں احمدیوں کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے طرزِ عمل مزید واضح کروں اور اس طرزِ عمل کو حق بجانب ثابت کروں۔ بعض یہ دریافت کرتے ہیں۔ کہ میں احمدیت میں کس مسئلہ کو تنقیح طلب سمجھتا ہوں۔ اس بیان میں اُن مطالبات کو پورا کرنا چاہتا ہوں۔ جن کو میں بالکل جائز تصوّر کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد اُن سوالات کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ جو پنڈت جواہر لال نہرو نے اُٹھائے ہیں۔ بہرحال مجھے اندیشہ ہے۔ کہ اس بیان کا ایک حصّہ پنڈت جی کے لئے دلچسپ نہ ہوگا۔ لہٰذا اُن کا وقت بچانے کے لئے میرا یہ مشورہ ہے۔ کہ وہ ایسے حصوں کو نظر انداز کر دیں۔

میرے لئے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہ پنڈت جی کو مشرق کے بلکہ ساری دنیا کے ایک عظیم الشان مسئلہ سے جو دلچسپی ہے۔ میں اُس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میری رائے میں یہ پہلے ہندوستانی قوم پرست قائد ہیں۔ جنہوں نے دُنیائے اسلام کی موجودہ روحانی بے چینی کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس بے چینی کے مختلف پہلوؤں اور ممکنہ ردِّ عمل کے مدِّ نظر ہندوستان کے ذی فکر سیاسی قائدین کو چاہیئے۔ کہ اس وقت قلبِ اسلام میں جو چیز ہیجان برپا کر رہی ہے اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

بہرحال میں اس واقعہ کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا۔ کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ پنڈت جی ایک ایسے انسان ہیں جو مختلف تہذیبوں سے وسیع ہمدردی رکھتے ہیں۔ میرا ذہن اس خیال کی طرف مائل ہے کہ جن سوالات کو وہ سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ تاہم جس طریقہ سے انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے ایسی ذہنیت کا

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

پتہ چلتا ہے۔ جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ میں اس خیال کی طرف مائل ہوں۔ کہ میں نے قادیانیت کے متعلق جو بیان دیا تھا (جس میں ایک مذہبی نظریہ کی محض جدید اصولوں کے مطابق تشریح کی گئی تھی) اس سے پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل دیا ہے۔ اس بات کو گوارا نہیں کرتے۔ کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خود مختاری پیدا ہو۔ میری رائے میں ان کا یہ خیال غلط ہے۔ کہ ہندوستانی قومیت کیلئے ملک کی مختلف تہذیبوں کو مٹا دینا چاہیئے۔ حالانکہ ان تہذیبوں کے باہمی عمل و اثر سے ہندوستان ایک ترقی پذیر اور پائیدار تہذیب کو نمو دے سکتا ہے ان طریقوں سے جو تہذیب نمو پائیگی۔ اس کا نتیجہ بجز باہمی تشدد اور تلخی کے اور کیا ہوگا۔ یہ بات بھی بدیہی ہے۔ کہ قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی نفوذ کی ترقی سے ان کا یہ مقصد یقیناً فوت ہو جائیگا۔ کہ پیغمبرِ عرب کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی امت تیار کریں۔ حیرت کی بات ہے کہ میری یہ کوشش کہ مسلمانانِ ہند کو اس امر سے متنبہ کروں۔ کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس دور سے وہ گذر رہے ہیں۔ اس میں ان کا اندرونی استحکام کس قدر ضروری ہے۔ اور ان انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر ناگزیر ہے۔ جو اسلامی تحریکات کے بھیس میں پیش ہوتی ہیں۔ پنڈت جی کو یہ موقع دیتی ہے۔ کہ ایسی تحریکوں (احمدیت) سے ہمدردی کریں۔

بہرکیف میں پنڈت جی کے محرکات کی تحلیل کے ناگوار فرض کو جاری رکھنا نہیں چاہتا۔ جو لوگ قادیانیت کے متعلق عام مسلمانوں کے طرزِ عمل کی توضیح چاہتے ہیں۔ ان کے استفادہ کیلئے میں ڈیورنٹ کی کتاب "افسانۂ فلسفہ" کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ جس سے قارئین کو واضح طور پر معلوم ہو جائیگا کہ قادیانیت میں امر تنقیح طلب کیا ہے۔ ڈیورنٹ نے فلسفیِ اعظم اسپینوزا کے جماعت بدر کئے جانے سے متعلق یہودی نقطۂ نظر کو اختصار کے ساتھ چند جملوں میں بیان کیا ہے۔ قارئین یہ خیال نہ کریں۔ کہ اس اقتباس کے پیش کرنے سے میرا مطلب اسپینوزا اور بانیِ احمدیت میں کسی قسم کا موازنہ کرنا ہے۔ عقل و سیرت کے لحاظ سے ان دونوں کے مابین بُعدِ عظیم ہے۔ "خدا مست" اسپینوزا نے کبھی دعوے نہیں کیا۔ کہ وہ کسی جدید عظیم کا مرکز ہے۔ اور جو یہودی اس پر ایمان نہ لائے یہودیت سے خارج ہے۔ اسپینوزا کے جماعت بدر کئے جانے کے متعلق ڈیورنٹ کی عبارت یہودیوں کے

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

طرزِ عمل پر اسقدر منطبق نہیں ہوتی جسقدر کہ قادیانیت کے متعلق مسلمانوں کے طرزِ عمل پر ہوتی ہے یہ عبارت حسب ذیل ہے۔

"علاوہ برین اکابرینِ یہود کا خیال تھا کہ امسٹرڈم میں ان کی جو چھوٹی سی جماعت تھی۔ اُسکو انتشار سے بچانے کا واحد ذریعہ مذہبی وحدت ہے اور یہودیوں کی جماعت کو جو دنیا میں بکھری ہوئی ہے برقرار رکھنے اور ان میں اتفاق پیدا کرنیکا آخری ذریعہ بھی یہی ہے۔ اگر ان کی اپنی کوئی سلطنت کوئی ملکی قانون، اور دنیاوی قوت و طاقت کے ادارے ہوتے جن کے ذریعہ وہ اندرونی استحکام اور بیرونی احترام حاصل کرتے۔ تو وہ زیادہ روادار ہوتے۔ لیکن ان کا مذہب ان کیلئے ایمان بھی تھا۔ اور حب الوطنی بھی۔ ان کا معبد ان کی عبادت اور مذہبی رسوم کے علاوہ ان کی سماجی اور سیاسی زندگی کا بھی مرکز تھا۔ ان حالات کے تحت انہوں نے الحاد کو غداری اور رواداری کو خودکشی تصور لیا۔"

امسٹرڈم میں یہودیوں کی حیثیت ایک اقلیت کی تھی۔ اس لحاظ سے وہ اسپینوزا کو ایسی انتشار انگیز ہستی سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ جس سے ان کی جماعت کے بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔ اسی طرح مسلمانانِ ہند یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ کہ تحریک قادیانیت جو تمام دنیائے اسلام کو کافر قرار دیتی ہے۔ اور اس سے معاشی مقاطعہ کرتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی حیاتِ ملی کیلئے اسپینوزا کی اس مابعد الطبیعیات سے زیادہ خطرناک ہے۔ جو یہود کی حیاتِ ملی کے لئے تھی۔ میرا خیال ہے۔ کہ مسلمانانِ ہند اُن حالات کی مخصوص نوعیت کو جبلّی طور پر محسوس کرتے ہیں۔ جن میں کہ وہ ہندوستان میں گھرے ہوئے ہیں۔ اور دوسرے ممالک کے مقابلہ میں انتشار انگیز قوتوں کا قدرتی طور پر زیادہ احساس رکھتے ہیں۔ ایک وسیع مسلمان کا یہ جبلّی ادراک میری رائے میں بالکل صحیح ہے۔ اور اسمیں شک نہیں۔ کہ اس احساس کی بنیاد مسلمانانِ ہند کی ضمیر کی گہرائیوں میں ہے۔

اس قسم کے معاملات میں جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں وہ لفظِ رواداری کے استعمال میں بے حد غیر محتاط ہیں اور مجھے اندیشہ ہے۔ کہ وہ لوگ اس لفظ کو بالکل نہیں سمجھتے۔ رواداری کی روح ذہن انسانی کے مختلف نقاطِ نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ گبن کہتا ہے۔ کہ "ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے۔ جس کے نزدیک تمام مذاہب یکسان طور پر صحیح ہیں۔ ایک رواداری مؤرخ کی ہے۔ جس کے نزدیک تمام مذاہب یکسان طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری مدبر کی ہے۔ جس کے نزدیک تمام مذاہب یکسان طور پر مفید ہیں۔" ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر قسم کے فکر و عمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے ایک رواداری کمزور آدمی کی ہوتی ہے۔ جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو جو اس کی محبوب اشیاء یا اشخاص کی کیجاتی ہے۔ برداشت کر لیتا ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے۔ کہ اس قسم کی رواداری اخلاقی

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

قدر سے معرّا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس سے اس شخص کے روحانی افلاس کا اظہار ہوتا ہے۔ جو ایسی رواداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ حقیقی رواداری عقلی و روحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رواداری ایسے شخص کی ہوتی ہے۔ جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کے سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کو روا رکھتا ہے۔ اور ان کی قدر کر سکتا ہے ایک سچا مسلمان ہی اس قسم کی رواداری کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خود اس کا مذہب ایتلافی ہے۔ اسی وجہ سے وہ بآسانی دوسرے مذاہب سے ہمدردی رکھ سکتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ ہندوستان کے شہنشاہ اعظم امیر خسروؒ نے ایک بت پرست کے قصہ میں اس قسم کی رواداری کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے ؎

اے کہ زنبت طعنہ بہ ہندو بری
ہم زرہے آموز پرستش گری

خدا کا ایک سچا پرستار ہی عبادت و پرستش کی قدر و قیمت کو محسوس کر سکتا ہے۔ خواہ اس پرستش کا تعلّق ایسے ارباب سے ہو۔ جن پر وہ اعتقاد نہیں رکھتا رواداری کی تلقین کرنے والے اس شخص پر عدم رواداری کا الزام لگانے میں غلطی کرتے ہیں۔ جو اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس طرز عمل کو وہ غلطی سے اخلاقی کمتری کرتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے ہیں۔ کہ اس کے طرز عمل میں حیاتیاتی قدر و قیمت مضمر ہے۔ جب کسی جماعت کے افراد جبلّی طور پر یا کسی عقلی دلیل کی بنا پر یہ محسوس کرتے ہوں۔ کہ اس جماعت کی اجتماعی زندگی خطرہ میں ہے۔ جس کے یہ رکن ہیں۔ تو ان کے مدافعانہ طرز عمل کو حیاتیاتی معیار پر جانچنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں ہر فکر و عمل کی تحقیق اس لحاظ سے کرنی چاہئے۔ کہ اس میں حیات افروزی کس قدر ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے۔ کہ ایسے شخص کے متعلق جو ملحد قرار دیا گیا ہو۔ کسی فرد یا جماعت کا رویہ اخلاقاً صائب ہے۔ یا غیر صائب۔ سوال یہ ہے کہ یہ حیات افروز ہے۔ یا حیات کش ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں۔ کہ جو جماعت مذہبی اصولوں پر قائم ہوتی ہے۔ وہ محکمۂ احتساب[1] کے قیام کو مستلزم ہے تاریخ مسیحیت کے متعلق یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن تاریخ اسلام پنڈت جی کی منطق کے خلاف یہ ثابت کرتی ہے۔ کہ جہاں اسلامی کے گذشتہ تیرہ سو سال میں اسلامی ممالک محکمۂ احتساب سے بالکل ناآشنا رہے ہیں۔ قرآن واضح طور پر ایسے ادارے کی ممانعت کرتا ہے۔ "دوسروں کی کمزوریوں کی تلاش نہ کرو۔ اور بھائیوں کی چغلی نہ کھاؤ"۔ پنڈت جی کو تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہو جائیگا۔ کہ یہودی اور عیسائی اپنے وطن کے مذہبی تشدد سے تنگ آکر اسلامی ممالک میں پناہ لیتے تھے۔ جن دو قضایا پر اسلام کی تعقلی عمارت قائم ہے۔ وہ بقدر

---

[1] قرون وسطیٰ میں (INSTITUTION) کے نام سے ایک محکمہ قائم ہوا تھا۔ جو لوگوں کے عقائد مذہبی کی تحقیق و تفتیش کرتا تھا۔ برونو وغیرہ جیسے علمائے سائنس کو اس محکمہ نے نذر آتش کر دیا۔ م

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

سادہ ہیں۔ کہ ان میں ایسا الحاد ناممکن ہے جس سے ملحد دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے یہ سچ ہے کہ جب کوئی شخص ایسے ملحدانہ نظریات کو رواج دیتا ہے۔ جن سے نظام اجتماعی خطرہ میں پڑ جاتا ہو تو ایک آزاد اسلامی ریاست یقیناً اس کا انسداد کریگی لیکن ایسی صورت میں ریاست کا فعل سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہوگا۔ نہ کہ خالص مذہبی اصولوں پر میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں۔ کہ پنڈت جی جیسا شخص جسکی پیدائش اور تربیت ایک ایسی جماعت میں ہوئی ہے جس کی سرحدیں متعین نہیں ہیں۔ اور جس میں اندرونی استحکام بھی مفقود ہے۔ اس امر کا تعقل کر سکتا ہے۔ کہ ایک مذہبی جماعت ایسے محکمۂ احتساب کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے۔ جو حکومت کی جانب سے عوام کے عقائد کی تحقیقات کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ یہ بات کارڈنل نیومن کی اس عبارت سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ جو پنڈت جی پیش کر کے حیرت کرتے ہیں۔ کہ میں کارڈنل کے اصول کو کس حد تک اسلام پر قابل اطلاق سمجھتا ہوں۔ میں ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ اسلام کی اندرونی ہیئت بھی اور کیتھولک مسیحیت میں اختلاف عظیم ہے کیتھولک مسیحیت کی پیچیدگی اس کی فوق العقل توضیحات اور تحکمی عقائد کی کثرت نے جیسا کہ تاریخ مسیحیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ ملحدانہ تاویلات کیلئے راستے کھول دیا ہے۔ اسلام کا سیدھا سادہ مذہب دو قضایا پر مبنی ہے۔ خدا ایک ہے۔ اور حضرت محمد صلعم اس سلسلۂ انبیاء کے آخری نبی ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً ہر ملک اور ہر زمانہ میں اس غرض سے مبعوث ہوئے تھے۔ کہ نوع انسان کی رہنمائی صحیح طرز زندگی کی طرف کریں۔ جیسا کہ بعض عیسائی مصنفین خیال کرتے ہیں۔ کہ کسی تحکمی عقیدے کی تعریف اسطرح کیجانی چاہیئے کہ وہ ایک فوق العقلی قضیہ ہے۔ اور اسکو مذہبی استحکام کی خاطر اور اس کا مابعد الطبعی مفہوم سمجھے بغیر مان لینا چاہیئے۔ تو اس لحاظ سے اسلام کے ان دو سادہ قضایا کو تحکمی عقیدے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کی تائید نوع انسان کے تجربے سے ہوتی ہے۔ اور ان کی عقلی توجیہہ بخوبی کیجا سکتی ہے۔ ایسے الحاد کا سوال یہاں یہ فیصلہ کرنا پڑے۔ کہ آیا اس کا مرتکب دائرہ مذہب میں ہے۔ یا اس سے خارج ہے۔ ایسی مذہبی جماعت میں جو ایسے سادہ قضایا پر مبنی ہو۔ اس صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ ملحد ان قضایا میں سے کسی ایک یا دونوں میں سے انکار کرتے ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسا واقعہ شاذ ہی وقوع پذیر ہوا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیئے۔ کیونکہ جب اس قسم کی کوئی بغاوت پیدا ہوتی ہے۔ تو ایک اوسط مسلمان کا احساس قومی خطرہ پر شدید ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اسلامی ایران کا احساس بھائیوں کے خلاف اسقدر شدید تھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ مسلمانان ہند کا احساس قادیانیوں کے خلاف

CC-0. JNACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

یہ سچ ہے۔ کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقے فقہ اور دینیات کے فروعی مسایل کے اختلاف کی وجہ سے اکثر و بیشتر ایکدوسرے پر الحاد کا الزام لگاتے رہے ہیں۔ دینیات کے فروعی مسائیل کے اختلاف ہیں اور نیز الحاد کی ایسی انتہائی صورتوں میں جہاں ملحد کو جماعت سے خارج کیا جاتا ہے۔ لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان جو مسلمانوں کے دینیاتی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ ملّت اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتی ہیں یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ فروعی مسایل کے اختلاف میں ایکدوسرے پر الحاد کا الزام لگانا باعث انتشار ہونے کے بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنیکا ذریعہ بن گیا ہے۔ پروفیسر ہرخورنجی کہتے ہیں۔ کہ "جب ہم فقہ اسلامی کے نشو و نما کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ایک طرف تو ہر زمانہ کے علماء خفیف سے اشتعال پر ایکدوسرے کی مذمت یہاں تک کرتے ہیں۔ کہ ایکدوسرے پر کفر کا الزام عائد ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف یہی لوگ زیادہ سے زیادہ اتحاد عمل کے ساتھ اپنے پیشروؤں کے اختلافات کو رفع کرتے ہیں۔" اسلامی دینیات کا متعلم جانتا ہے کہ مسلم فقہا اس قسم کے الحاد کو اصطلاحی زبان میں کفر زیر کفر سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی ایسا کفر جسمیں مرتکب جماعت سے خارج نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ [illegible] کے ذریعہ جن کا عقلی تعطل دینیاتی تفکر کے ہر اختلاف کو قطعی سمجھتا اور اختلاف میں اتحاد کو دیکھ [illegible] سکتا خفیف سا الحاد فتنہ عظیم کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس فتنہ کا انسداد اس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ ہم مدارس دینیات کے طلبائے کے سامنے اسلام کی ابتلائی روح کا واضح ترین تصور پیش کریں۔ اور ان کو یہ بتلائیں۔ کہ منطقی تضاد دینیاتی تفکر میں اصول حرکت کا کام کرتا ہے۔ یہ سوال کہ الحاد کبیرہ کس کو کہتے ہیں۔ اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ کسی مفکر یا مصلح کی تعلیم [illegible] اسلام کی سرحدوں پر اثر انداز ہوتی ہے [illegible] سے قادیانیت کی تعلیم میں یہ سوال پیدا [illegible] ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ تحریک احمدیت دو جماعتوں میں منقسم ہے۔ جو قادیانی اور لاہوری جماعتوں کے نام سے موسوم ہے اول الذکر جماعت بانی احمدیت کو نبی تسلیم کرتی ہے۔ آخر الذکر نے اعتقاداً یا مصلحتاً قادیانیت کی شدت کو کم کر کے پیش کرنا مناسب سمجھا۔ بہرحال یہ سوال کہ آیا بانی احمدیت ایک نبی تھا۔ اور اسکی تعلیم سے انکار کرنا "الحاد کبیرہ" کو مستلزم ہے۔ ان دو جماعتوں میں متنازعہ فیہ ہے۔ احمدیوں کے ان گھریلو مناقشات کے محاسن کو جانچنا میرے پیش نظر مقصد کے لئے غیر ضروری ہے۔ میرا یقین ہے، جس کے وجوہ میں آگے چل کر بیان کرونگا۔ کہ ایک ایسے نبی کا تصور جس کے انکار کرنے سے منکر خارج اسلام

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

ہو جاتا ہے۔ احمدیت کا ایک لازمی عنصر ہے۔ اور لاہوری جماعت کے امام کے مقابلہ میں قادیانیوں کے موجودہ پیشوا تحریک احمدیت کی روح سے بالکل قریب ہیں۔

ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے اس کے معنی بالکل سلیس ہیں۔ حضرت محمد صلعم کے بعد جنہوں نے اپنی پیروؤں کو ایسا قانون عطا کر کے جو ضمیر انسانی کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ آزادی کا راستہ دکھا دیا ہے۔ کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سر نیاز خم نہ کیا جائے۔ دنیاوی نقطہ نظر سے اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں۔ کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں۔ مکمل اور ابدی ہے حضرت محمد صلعم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعوے کرتا ہے۔ وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے۔ کہ تحریک احمدیت کا بانی ایسے الہام کا حامل تھا۔ لہذا وہ تمام عالم اسلامی کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانی احمدیت کا استدلال جو قرون وسطیٰ کے متکلمین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا کر سکے۔ تو پیغمبر اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائیگی۔ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ پیغمبر اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی۔ خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے لیکن آپ پھر اس سے دریافت کریں۔ کہ آیا حضرت محمد صلعم کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تو اس کا جواب "نفی" میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے برابر ہے کہ حضرت محمد صلعم آخری نبی نہیں ہیں آخری نبی ہوں" اس امر کے سمجھنے کے بجائے کہ ختم نبوت کا اسلامی تصور نوع انسان کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا تہذیبی قدر و قیمت رکھتا ہے بانی احمدیت کا خیال ہے۔ کہ ختم نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ حضرت محمد صلعم کا کوئی پیرو نبوت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ خود حضرت محمد صلعم کی نبوت کو نامکمل ثابت کرتا ہے۔ جب میں بانی احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ اس کے دعوے نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیغمبر اسلام کی روحانیت کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبر اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی ورثہ کی ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔

اس کا دعوے ہے۔ کہ میں پیغمبر اسلام کا بروز ہوں۔ اس سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ کہ پیغمبر اسلام کا بروز ہونے کی حیثیت سے اس کا خاتم النبیین ہونا درحقیقت حضرت محمد صلعم کا خاتم النبیین ہونا ہے۔ پس یہ نقطہ نظر پیغمبر اسلام کی

CC-0. NMACH Kashmir. Digitized by eGangotri

ختم نبوت کو مسترد نہیں کرتا۔ اپنی ختم نبوّت کو پیغمبر اسلام کی ختم نبوّت کے مماثل قرار دیکر بانی احمدیت نے ختم نبوت کے تصور کے زمانی مفہوم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بہر حال یہ ایک بدیہی بات ہے کہ بروز کا لفظ مکمل مشابہت کے مفہوم میں بھی اسکی مدد نہیں کرتا۔ کیونکہ بروز ہمیشہ اس شے سے الگ ہوتا ہے جس کا یہ بروز ہوتا ہے۔ صرف اوتار کے معنوں میں بروز اور اس شے میں عینیت پائی جاتی ہے پس اگر ہم بروز سے "روحانی صفات کی مشابہت" مراد لیں۔ تو یہ دلیل بے اثر رہتی ہے۔ اگر اس کے برعکس اس لفظ کے آریائی مفہوم میں اصل شے کا اوتار مراد لیں تو یہ دلیل بظاہر قابل قبول ہوتی ہے لیکن اس خیال کا موجد مجوسی بھیس میں نظر آتا ہے

ہسپانیہ کے برگزیدہ صوفی محی الدین ابن عربی کی سند پر یہ مزید دعوے کیا جاتا ہے۔ کہ ایک مسلمان ولی کے لئے اپنے ارتقاء کے دوران میں اس قسم کا تجربہ حاصل کرنا ممکن ہے۔ جو شعور نبوت سے مختص ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے۔ کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا یہ خیال نفسیاتی نقطۂ نظر سے درست نہیں۔ لیکن اگر اس کو صحیح فرض کر لیا جائے۔ تو تب بھی قادیانی استدلال شیخ کے موقف کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شیخ ایسے تجربہ کو ذاتی کمال تصوّر کرتے ہیں جس کی بنا پر کوئی ولی یہ اعلان نہیں کر سکتا۔ کہ جو شخص اس پر (یعنی ولی پر) اعتقاد نہیں رکھتا۔ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

اس میں شک نہیں۔ کہ شیخ کے نقطۂ نظر سے ایک ہی زمانہ اور ملک میں ایک سے زیادہ اولیاء موجود ہو سکتے ہیں۔ اور شعور نبوت تک پہنچ سکتے ہیں — غور طلب امر یہ ہے۔ کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک ولی کا شعور نبوّت تک پہنچنا اگرچہ ممکن ہے۔ تاہم اس کا تجربہ اجتماعی اور سیاسی اہمیّت نہیں رکھتا اور نہ اس کو کسی نئی تنظیم کا مرکز بناتا ہے۔ اور نہ یہ استحقاق عطا کرتا ہے۔ کہ وہ اس نئی تنظیم کو پیروان حضرت محمد صلعم کے ایمان یا کفر کا معیار قرار دے۔

اس صوفیانہ نفسیات سے قطع نظر کر کے "فتوحات" کی متعلقہ عبارتوں کو پڑھنے کے بعد میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہسپانیہ کا یہ عظیم الشان صوفی حضرت محمد صلعم کی ختم نبوت پر اسی طرح مستحکم ایمان رکھتا ہے۔ جس طرح کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان رکھ سکتا ہے اگر شیخ کو اپنے صوفیانہ کشف میں یہ نظر آجاتا۔ کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی جنہیں تصوف کا شوق ہے۔ شیخ کی صوفیانہ نفسیات کی آڑ میں پیغمبر اسلام کی ختم نبوّت سے انکار کر دینگے۔ تو وہ یقیناً علمائے ہند سے بہت پہلے مسلمانان عالم کو ایسے غداران اسلام سے متنبہ کر دیتے۔

اب احمدیت کی روح پر غور کرنا ہے۔ اس کے ماخذ اور اس امر کی بحث کہ قبل اسلامی مجوسی تصورات نے اسلامی تصوف کے ذریعہ بانی احمدیت کے ذہن کو کس طرح متاثر کیا۔ مذہب تقابلہ کے نقطہ نظر سے

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

بے وجہ تعجب ہوگی۔ لیکن میرے لئے اس بحث کو اٹھانا ممکن نہیں۔ یہ کہہ دینا کافی ہے۔ کہ احمدیت کی اصل حقیقت قرونِ وسطیٰ کا تصوف اور دینیات کی نقاب میں پوشیدہ ہے۔ انگریز نے ہندنے اسکو محض ایک دینیاتی تحریک تصور کیا۔ اور دینیاتی حربوں سے اس کا مقابلہ کرنے نکل آئے۔ بہرحال میرا خیال ہے۔ کہ اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ طریقہ موزوں نہیں اسی وجہ سے علما کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ بانی احمدیت کے الہامات کی اگر دقیق النظری سے تحلیل کیجائے۔ تو یہ ایک ایسا مؤثر طریقہ ہوگا۔ جس کے ذریعے سے ہم اس کی شخصیت اور اندرونی زندگی کا تجزیہ کرسکیں گے۔ اس سلسلہ میں اس امر کو واضح کردینا چاہتا ہوں۔ کہ مولوی منظور الٰہی نے بانی احمدیت کے الہامات کا جو مجموعہ شایع کیا ہے۔ اس میں نفسیاتی تحقیق کے لئے متنوع اور مختلف مواد موجود ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بانی احمدیت کی سیرت اور شخصیت کی کنجی ہے۔ اور مجھے امید ہے۔ کہ کسی دن نفسیات جدید کا کوئی متعلم اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کریگا۔ اگر وہ قرآن کو اپنا معیار قرار دے اور چند وجوہ سے اس کو ایسا کرنا ہی پڑیگا جنکی تشریح یہاں نہیں کیجا سکتی۔ اور اپنے مطالعہ کو بانی احمدیت اور اس کے ہمعصر غیر مسلم صوفیاء جیسے رام کرشنا بنگالی کے تجربوں تک پھیلائے۔ تو اس کو اس تجزیہ کی اصل ماہیت کے متعلق بڑی حیرت ہوگی جسکی بناء پر بانی احمدیت نبوت کا دعویدار رہے۔

عامی آدمی کے نقطۂ نظر سے ایک اور موثر و مفید طریقہ یہ ہے کہ ۱۷۹۹ء ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے۔ اسکی روشنی میں دینیات کے سیاسی نظروذ کو سمجھنے کی کوشش کیجائے دنیائے اسلام کی تاریخ میں ۱۷۹۹ء بے حد اہم ہے اسی سال ٹیپو کی شکست ہوئی۔ اسکی شکست کے ساتھ مسلمانوں کا ہندوستان میں سیاسی نفوذ حاصل کرنے کی جو امید تھی۔ اس کا بھی خاتمہ ہوگیا اور سامراج جنگ اور تیموری وقوع پذیر ہوئی۔ جس میں دہلی کا بیڑہ تباہ ہوگیا۔ جو لوگ سرنگاپٹم گئے ہیں ان کو ٹیپو کے مقبرہ پر یہ تاریخ وفات کندہ نظر آئی ہوگی۔

"ہندوستان اور روم کی عظمت ختم ہوگئی"

سلطان ٹیپو شہید کا تاریخ رحلت:-

ان اخذت مصر کما قد ذکروا
وسریخ فتن اخذت وربما
مصیبۃ ما مسلھا ارخھا
ذھب عز الروم والھند کلھا

۱۲ ھ ۱۳
۱۷ ع ۹۹

سرنگاپٹن

ایک قطعہ کا تاریخی مصرع یہ ہے:-

یکے زان میان گفت "شمشیر گم شد"

۱۳ — ۱۲ ھ

سلطان ٹیپو نے مقبرہ خود بنوایا تھا۔ اسمیں ان کے والد سلطان حیدر علی اور خود ان کی والدہ کی

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

قبریں ہیں۔ مقبرہ کے چاروں طرف برآمدہ ہے۔ جو سیاہ سرمر کے ستونوں پر کھڑا ہے۔ جنوبی برآمدہ اور صحن میں سلطان کے اعزہ واقربا کی قبریں ہیں۔ مقبرہ کے باہر مغربی دروازہ پر تاریخیں لکھی ہیں۔

(مفتی)

ان الفاظ کے مصنف نے پیشینگوئی کی تھی۔ پس ۱۸۹۹ء میں ایشیا میں اسلام کا انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ لیکن جسطرح کہ دنیا میں جرمنی کی شکست کے بعد جدید جرمن قوم کا نشوونما ہوا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اسی طرح ۱۹۲۴ء میں اسلام کی سیاسی شکست کے بعد جدید اسلام اور اس کے مسایل معرض ظہور میں آئے اس امر پر میں آگے چلکر بحث کرونگا۔ فی الحال میں قارئین کی توجہ چند مسائل کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ٹیپو کی شکست اور ایشیا میں مغربی شہنشاہیت کی آمد کے بعد سے اسلامی ہند میں پیدا ہو گئے ہیں۔

کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟ مسلمانان ہند اور وہ مسلمان جو ترکی سلطنت سے باہر ہیں۔ ترکی خلافت سے کیا تعلق رکھتے ہیں؟ ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟ اسلام میں نظریۂ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ قرآن کی ایک آیت میں لفظ "تم میں سے" کے کیا معنی ہیں؟ خدا، رسول اور اولوالامر کی اطاعت کا کیا مفہوم ہے؟ احادیث سے آمد مہدی کی جو پیشینگوئی کی جاتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ یہ اور اسی قبیل کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق بلا واسطہ صرف مسلمانان ہند سے تھا۔ اس کے علاوہ مغربی شہنشاہیت کو بھی جو اسوقت اسلامی دنیا میں سرعت کے ساتھ تسلط حاصل کر رہی تھی۔ ان سوالات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے۔ وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک باب ہیں یہ حکایت دراز ہے۔ اور ایک طاقتور قلم کی منتظر۔ مسلمان ارباب سیاست جن کی آنکھیں اتفاقات پر جمی ہوئی تھیں۔ علما کے ایک طبقہ کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کہ وہ دینیاتی استدلال کا ایسا طریقہ اختیار کریں۔ جو صورت حال کے مناسب ہو لیکن محض منطق سے ایسے عقاید پر فتح پانا آسان نہ تھا جو صدیوں سے مسلمانان ہند کے قلوب پر حکمران تھے ایسے حالات میں منطق یا تو سیاسی مصلحت کی بنیاد پر آگے بڑھ سکتی ہے۔ یا قرآن و حدیث کی نئی تفسیر کے ذریعہ۔ ہر دو صورتوں میں استدلال عوام کو متاثر کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے۔ صرف ایک ہی چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے۔ اور وہ روایتی سند سے راسخ عقاید کو مؤثر طریقہ پر منانے اور متذکرۂ صدر سوالات میں جو دینیاتی نظریات مضمر ہیں۔ ان کی نئی تفسیر کرنے کے لئے جو سیاسی اعتبار سے موزوں ہو۔ ایک الہامی بنیاد ضروری سمجھی گئی۔ اس الہامی بنیاد کو احمدیت نے فراہم کر دیا۔ خود احمدیوں کا یہ دعوا ہے۔ کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے۔ جو انہوں نے انجام دی ہے۔ پیغمبرانہ

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

الہام کو ایسے دینیاتی خیالات کی بنیاد قرار دینا جو سیاسی اہمیت رکھتے ہیں۔ گویا اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ جو لوگ مدعی نبوت کے خیالات کو قبول نہیں کرتے اول درجہ کے کافر ہیں۔ اور ان کا ٹھکانہ نار جہنم ہے جہاں تک میں نے اس تحریک کے منشاء کو سمجھا ہے۔ احمدیوں کا یہ اعتقاد ہے۔ کہ مسیح کی موت ایک عام فانی انسان کی موت تھی۔ اور رجعت مسیح گویا ایسے شخص کی آمد ہے۔ جو روحانی حیثیت سے اس کا مشابہ ہے اس خیال سے اس تحریک پر ایک طرح کا عقلی رنگ چڑھ جاتا ہے۔ لیکن یہ ابتدائی مدارج ہیں۔ اس تصور نبوت سے جو ایسی تحریک کے اغراض کو پورا کرتا ہے جسکو جدید سیاسی قوتیں وجود میں لائی ہیں۔ ایسے ممالک میں جو ابھی تمدن کے ابتدائی منازل میں ہیں منطق سے زیادہ سند کا اثر ہوتا ہے۔ اگر کافی جہالت اور زود اعتقادی موجود ہو۔ اور کوئی شخص اس قدر بے باک ہو کہ حامل الہام ہونے کا دعوے کرے۔ جس سے انکار کرنے والا ہمیشہ کیلئے گرفتار لعنت ہو جاتا ہے۔ تو ایک محکوم اسلامی ملک میں ایک سیاسی دینیات کو وجود میں لانا اور ایک ایسی جماعت کو تشکیل دینا آسان ہو جاتا ہے جس کا مسلک سیاسی محکومیت ہو۔ پنجاب میں مبہم دینیاتی عقائد کا فرسودہ جال اس سادہ لوح دہقان کو آسانی سے مسخر کر لیتا ہے۔ جو صدیوں سے ظلم و ستم کا شکار رہا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو مشورہ دیتے ہیں۔ کہ تمام مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگ متحد ہو جائیں۔ اور اس چیز کی مزاحمت کریں۔ جسکو وہ ہندوستانی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ طنز آمیز مشورہ اس بات کو فرض کر لیتا ہے۔ کہ احمدیت ایک اصلاحی تحریک ہے۔ وہ نہیں جانتے۔ کہ جہاں تک ہندوستان میں اسلام کا تعلق ہے۔ احمدیت میں اہم ترین مذہبی اور سیاسی امور تنقیح طلب مضمر ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر تشریح کی ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرنا ہے خالص مذہبی امور سے قطع نظر سیاسی امور کی بنا پر بھی پنڈت جواہر لال نہرو کے شایان شان نہیں۔ کہ وہ مسلمانان ہند پر رجعت پسند اور قدامت پرست ہونے کا الزام لگائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ احمدیت کی اصل نوعیت کو سمجھ لیتے تو مسلمانان ہند کے اس رویہ کی ضرور تعریف و تحسین کرتے۔ جو ایک ایسی مذہبی تحریک کے متعلق اختیار کیا گیا ہے۔ جو ہندوستان کے تمام آفات و مصائب کیلئے الہامی سند پیش کرتی ہے۔

پس قارئین کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ اسلام کے رخساروں پر اسوقت احمدیت کی جو زدی نظر آ رہی ہے۔ وہ مسلمانان ہند کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں کوئی ناگہانی واقعہ نہیں ہے۔ وہ خیالات جو بالآخر اس تحریک میں رونما ہوئے ہیں۔ بانی احمدیت کی ولادت سے بہت پہلے دینیاتی مباحث میں نمایاں رہ چکے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

بانیٔ احمدیت اور اس کے رفقاء نے سوچ سمجھ کر
اپنا پروگرام تیار کیا ہے۔ میں یہ ضرور کہونگا۔ کہ
بانی احمدیت نے ایک آواز سنی۔ لیکن اس امر کا
تصفیہ کہ یہ آواز اس خدا کی طرف سے تھی۔ جس کے
ہاتھ میں زندگی اور طاقت ہے۔ یا لوگوں کے ذہنی
افلاس سے پیدا ہوئی اس تحریک کی نوعیت پر
منحصر تھا۔ چاہیئے۔ جو اس آواز کی آفرید ہے۔
اور ان افکار و جذبات پر بھی جو اس آواز نے اپنے
سننے والوں میں پیدا کئے ہیں۔ قارئین یہ نہ
سمجھیں۔ کہ میں استعارات استعمال کر رہا ہوں۔
اقوام کی تاریخ حیات بتلاتی ہے۔ کہ جب کسی قوم
کی زندگی میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو انحطاط
ہی الہام کا ماخذ بن جاتا ہے۔ اور اس قوم کے شعراء
فلاسفر، اولیاء، مدبرین اس سے متاثر ہو جاتے ہیں
اور مبلغین کی ایک ایسی جماعت وجود میں آجاتی ہے
جس کا مقصد واحد یہ ہوتا ہے۔ کہ منطق کی سحر آفرین
قوتوں سے اس قوم کی زندگی کے ہر اس پہلو کی تعریف و
تحسین کرے۔ جو نہایت ذلیل اور قبیح ہوتا ہے
یہ مبلغین غیر شعوری طور پر مایوسی کو امید کے درخشاں
لباس میں چھپا دیتے ہیں۔ کردار کے روایتی اقتدار
کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ اور اس طرح ان لوگوں کی
روحانی قوت کو مٹا دیتے ہیں۔ جو ان کا شکار ہو جاتے
ہیں۔ ان لوگوں کی قوت ارادی پر ذرا غور کرو۔
جنہیں الہام کی بنیاد پر یہ تلقین کیجاتی ہے۔ کہ
اپنے سیاسی ماحول کو اٹل سمجھو۔ پس ہر نے خیال میں

وہ تمام ایکٹر جنہوں نے احمدیت کے ڈراما میں حصہ
لیا ہے۔ زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض
سادہ لوح کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ایران میں بھی
اس قسم کا ایک ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ لیکن اس میں وہ
سیاسی اور مذہبی امور پیدا ہوئے اور نہ ہو سکتے
تھے۔ جو احمدیت نے اسلام کے لئے ہندوستان میں
پیدا کئے ہیں۔ روس نے بابی مذہب روا رکھا۔
اور بابیوں کو اجازت دی۔ کہ اپنا پہلا تبلیغی مرکز
عشق آباد میں قایم کریں۔ انگلستان نے بھی احمدیوں
کے ساتھ رواداری برتی۔ اور ان کو اپنا پہلا تبلیغی
مرکز اوکنگ میں قایم کرنے کی اجازت دی۔ ہمارے
لئے اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ کہ آیا روس اور
انگلستان نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی
مصلحتوں کی بنا پر کیا یا وسعت نظر کی وجہ سے
اس قدر تو بالکل واضح ہے۔ کہ اس رواداری نے
اسلام کے لئے پیچیدہ مسایل پیدا کر دئے۔ اسلام کی
اس ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے جیسا کہ میں نے اس کو
سمجھا ہے۔ مجھے یقین کامل ہے۔ کہ اسلام ان دشواریوں
سے جو اس کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ زیادہ پاک و
صاف ہو کر نکلے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہندوستان کے
حالات ایک نیا رخ اختیار کر چکے ہیں۔ جمہوریت کی
نئی روح جو ہندوستان میں پھیل رہی ہے وہ یقیناً
احمدیوں کی آنکھیں کھول دیگی۔ اور انہیں یقین ہو جائیگا
کہ ان کی دینیاتی ایجادات بالکل بے سود ہیں۔

اور نہ اسلام قرون وسطیٰ کے اس تصوف کی

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

تجدید کو روا رکھیگا۔ جس نے اپنے پیروؤں کے صحیح رجحانات کو کچل کر ایک مبہم تفکر کی طرف اُن کا رُخ پھیر دیا تھا۔ اس تصوف نے گذشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے امورِ سلطنت کو معمولی آدمیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا تھا۔ جدید اسلام اس تجربے کو دُہرا نہیں سکتا۔ اور نہ وہ پنجاب کے اُس تجربے کے اعادے کو روا رکھ سکتا ہے۔ جس نے مسلمانوں کو نصف صدی تک ایسے دینیاتی مسایل میں اُلجھائے رکھا جن کا زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا اسلام جدید تفکر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے۔ اور کوئی ولی یا پیغمبر اُس کو قرونِ وسطیٰ کے تصوّف کی تاریکی کی طرف واپس نہیں لے جا سکتا۔

(۳)

اب میں پنڈت جواہر لال کے سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ پنڈت جی کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ اسلام یا انیسویں صدی کے اسلام کی مذہبی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ انہوں نے شاید میری تحریرات کا بھی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ جن میں انکے سوالات پر بحث کیگئی ہے۔ میرے لئے یہاں اُن تمام خیالات کا اعادہ کرنا ممکن نہیں۔ جنکو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ انیسویں صدی کے مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کو پیش کرنا بھی یہاں ممکن نہیں ہے۔ جس کے بغیر دنیائے اسلام کی موجودہ صورت حال کو پوری طرح سمجھنا دشوار ہے۔ ترکی اور جدید اسلام کے متعلق سینکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں اس لٹریچر کے بیشتر حصے کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اور غالباً پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس کا مطالعہ کر چکے ہونگے۔ بہرحال میں انہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ ان میں سے ایک مصنف نے بھی ان نتائج یا اُن اسباب کی اصل ماہیت کو نہیں سمجھا۔ جو ان نتائج کا باعث ہیں لہذا مسلمانوں کے تفکر کے مخصوص رجحانات کو جو انیسویں صدی کے ایشیا میں پائے جاتے تھے۔ اجمالی طور پر بیان کر دینا ضروری ہے۔

میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ کہ ۱۷۹۹ء میں اسلام کا سیاسی زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ بہرحال اسلام کی اندرونی قوت کا اس واقعہ سے برُا ٹھکہ کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ اُس نے فوراً ہی محسوس کر لیا۔ کہ دُنیا میں اس کا کیا موقف ہے۔ اُنیسویں صدی میں سرسید احمد خان ہندوستان میں، سید جمال الدین افغانی افغانستان میں، اور مفتی عالم جان روس میں پیدا ہوئے۔ یہ حضرات غالباً محمد ابن عبدالوہاب سے متاثر ہوئے تھے۔ جن کی ولادت ۱۷۰۰ء میں بمقام نجد ہوئی تھی۔ اور جو اس نام نہاد وہابی تحریک کے بانی تھے۔ جس کو صحیح طور پر جدید اسلام میں زندگی کی پہلی تڑپ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سرسید احمد خان کا اثر بحیثیت مجموعی ہندوستان ہی تک محدود رہا۔ غالباً یہ اثر جدید کے پہلے مسلمان تھے۔ جنہوں نے آنے والے دَور کی جھلک دیکھی تھی۔ اور یہ محسوس کیا تھا کہ ایجابی علوم اس دَور کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے نیز روس میں مفتی عالم جان نے مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم کو قرار دیا۔ مگر سید احمد خان کی حقیقی

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

عظمت اس واقعہ پر مبنی ہے۔ کہ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں۔ جنہوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اور اس کیلئے سرگرم عمل ہو گئے۔ ہم ان کے مذہبی خیالات سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ان کی حساس روح نے سب سے پہلے عصر جدید کے خلاف رد عمل کیا۔

مسلمانانِ ہند کی انتہائی قدامت پرستی جو زندگی کے حقایق سے دور ہو گئی تھی۔ سید احمد خان کے مذہبی نقطۂ نظر کے حقیقی مفہوم کو سمجھ نہ سکی۔ ہندوستان کے شمال مغربی حصہ میں ایسے حصہ میں جو ابھی تہذیب کی ابتدائی منزل میں ہے۔ اور جہاں دیگر اقطاع ہند کے مقابلہ میں پیر پرستی زیادہ مسلط ہے۔ سرسید کی تحریک کے خلاف احمدیت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک میں سامی اور آریائی تصوف کی عجیب و غریب آمیزش تھی۔ اور اس میں کسی فرد کا روحانی احیائے قدیم اسلامی تصوف کے اصولوں کے مطابق نہیں ہو سکتا تھا بلکہ "مسیح موعود" کی آمد کو پیش کر کے عوام کی کیفیت انتظار کو تشفی دیجاتی تھی۔ اس "مسیح موعود" کا فرض یہ نہیں تھا۔ کہ کسی فرد کو موجودہ پستی سے نجات دلائے۔ بلکہ اس کا کام یہ تعلیم دینا ہے۔ کہ لوگ اپنی روح کو غلامانہ طور پر پستی و انحطاط کے سپرد کر دیں۔ اس رد عمل ہی کے اندر ایک نازک تضاد مضمر ہے یہ تحریک اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے لیکن اس قوت ارادی کو فنا کر دیتی ہے۔ جس کو اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

مولانا سید جمال الدین افغانی کی شخصیت کچھ اور ہی تھی۔ قدرت کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ مذہبی فکر و عمل کے لحاظ سے ہمارے زمانہ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوتا ہے جمال الدین افغانی دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ ان کی فصاحت و بلاغت میں سحر آفرینی و دلیعت تھی۔ ان کی بے چین روح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی۔ اور اس نے ایران مصر اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا۔ ہمارے زمانہ کے بعض جلیل القدر علماء جیسے مفتی محمد عبدہٗ اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چلکر سیاسی قائدین گئے۔ جیسے مصر کے زاغلول پاشا وغیرہ انہی کے شاگردوں میں سے تھے انہوں نے لکھا کم اور کہا بہت اور اس طریقہ سے ان تمام لوگوں کو جنہیں ان کا قرب حاصل ہوا۔ چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا۔ انہوں نے کبھی نبی یا مجدد ہونے کا دعوےٰ نہیں کیا۔ پھر بھی ہمارے زمانہ کے کسی شخص نے روح اسلام میں اسقدر تڑپ نہیں پیدا کی جسقدر کہ انہوں نے کی تھی۔ ان کی روح اب بھی دنیائے اسلام میں سرگرم عمل ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا۔ کہ اسکی انتہا کہاں ہوگی۔

بہرحال یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان جلیل القدر ہستیوں کی غایت کیا تھی؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ انہوں نے دنیائے اسلام پر تین مخصوص قوتوں کو حکمران پایا۔ اور ان قوتوں کے خلاف بغاوت پیدا کرنے کیلئے

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

اپنی پوری طاقت کو مرتکز کر دیا۔

(۱) ملائیت۔ علماء ہمیشہ اسلام کے لئے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں۔ لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاصکر زوال بغداد کے زمانے سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے۔ اور آزادی اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کیلئے حوصلہ افروز تھی۔ درحقیقت ایک بغاوت تھی۔ علماء کے اسی جمود کے خلاف۔ پس انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقاید کی جدید تفسیر کیجائے۔ اور بڑھتے ہوئے تجربے کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کیجائے۔

(۲) تصوف مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا۔ جس نے حقایق سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ جس نے عوام کی قوت عمل کو ضعیف کر دیا تھا۔ اور انکو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوف اپنے اس اعلیٰ مرتبہ سے جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا۔ نیچے گر کر عوام کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نے بتدریج اور غیر محسوس طور پر مسلمانوں کی قوت ارادی کو کمزور اور اسقدر نرم کر دیا تھا۔ کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور مسلمانوں کو عصر جدید کی روشنی کیطرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ مصلحین مادہ پرست تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمان اسلام کی اس روح سے آشنا ہو جائیں۔ جو مادہ سے گریز کرنے کے بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

۳۔ ملوکیت۔ مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی۔ اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کیلئے وہ اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصد خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کی ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

مسلمانوں کے فکر و تاثر کی دنیا میں ان مصلحین نے جو انقلاب پیدا کیا ہے۔ اس کا تفصیلی بیان یہاں ممکن نہیں ہے۔ بہرحال ایک چیز بہت واضح ہے۔ ان مصلحین نے زاغلول پاشا، مصطفےٰ کمال اور رضا شاہ جیسی ہستیوں کی آمد کیلئے راستہ تیار کر لیا۔ ان مصلحین نے تعبیر و تفسیر، توجیہ و توضیح کی۔ لیکن جو افراد ان کے بعد آئے۔ اگرچہ اعلےٰ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ تاہم اپنے صحیح رجحانات پر اعتماد کر کے جرات کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑے۔ اور زندگی کی نئی ضروریات کا جو تقاضا تھا اس کو جبر و قوت سے پورا کیا۔ ایسے لوگوں سے غلطیاں بھی ہوا کرتی ہیں۔ لیکن تاریخ اقوام بتاتی ہے۔ کہ ان کی غلطیاں بھی بعض اوقات مفید نتایج پیدا کرتی ہیں۔ ان کے اندر منطق نہیں۔ بلکہ زندگی ہیجان برپا کر دیتی ہے۔ اور اپنے مسایل کو حل کرنیکے لئے مضطرب بے چین رہتی ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے۔ کہ سید احمد خان، سید جمال الدین افغانی

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

اور اُن کے سینکڑوں شاگرد جو اسلامی ممالک میں تھے
مغرب نے وہ مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ یہ وہ لوگ تھے۔
جنہوں نے قدیم مکتب کے ملاؤں کے آگے زانوئے ادب
تہہ کیا تھا۔ اور اُنہی عقلی و روحانی فضا میں سانس لی تھی
جس کی وہ از سرِ نو تعمیر کرنی چاہتے تھے۔ جدید خیالات کا
اثر ضرور پڑا ہے۔ لیکن جس تاریخ کا اجمالی طور پر اوپر
ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے۔
کہ ترکی میں جو انقلاب ظہور پذیر ہوا۔ اور جو جلد یا
بدیر دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ظہور پذیر ہونیوالا
ہے۔ بالکل اندرونی قوتوں کا آفریدہ تھا۔ جدید دنیائے
اسلام کو جو شخص سطحی نظر سے دیکھتا ہے۔ صرف
وہی شخص یہ خیال کر سکتا ہے۔ کہ دُنیائے اسلام کا
موجودہ انقلاب محض بیرونی قوتوں کا رہینِ منت ہے۔

کیا ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی
ممالک خاصکر ترکی نے اسلام کو ترک کر دیا ہے؟

پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں۔ کہ ترکی اب
اسلامی ملک نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو
محسوس نہیں کرتے۔ کہ یہ سوال کہ آیا کوئی شخص
یا جماعت اسلام سے خارج ہو گئی۔ مسلمانوں کے نقطۂ
نظر سے ایک خالص فقہی سوال ہے۔ اور اس کا فیصلہ
اسلام کی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے کرنا پڑیگا جبتک
کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصولوں پر ایمان
رکھتا۔ یعنی توحید اور ختمِ نبوت، تو اُسکو
ایک راسخ العقیدہ ملا بھی اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں
کر سکتا۔ خواہ فقہ اور آیاتِ قرآنی کی تاویلات میں
وہ کتنی ہی غلطیاں کرے۔ غالباً پنڈت جواہر لال نہرو کے
ذہن میں وہ مفروضہ یا حقیقی اصلاحات ہیں۔ جو
اتاترک نے رائج کی ہیں۔ اب ہم تھوڑی دیر کے لئے
ان کا جایزہ لیں گے۔ کیا ترکی میں ایک عام مادی
نقطۂ نظر کا نشو و نما اسلام کے منافی ہے؟ مسلمانوں میں
ترک دنیا کا بہت رواج رہ چکا ہے۔ مسلمانوں کے لئے
اب وقت آگیا ہے۔ کہ وہ حقایق کی طرف متوجہ ہوں۔
مادیت مذہب کے خلاف ایک بڑا ہوا ہے۔ لیکن ملا
اور صوفی کے پیشوں کے استیصال کیلئے ایک مؤثر
حربہ ہے۔ جو عمداً لوگوں کو اس غرض سے گرفتار
حیرت کر دیتے ہیں۔ کہ ان کی جہالت اور زہد و اعتقادی سے
فائدہ اٹھائیں۔ اسلام کی روح مادے کے قرب سے
نہیں ڈرتی۔ قرآن کا ارشاد ہے۔ کہ "تمہارا دنیا میں
جو حصہ ہے۔ اس کو نہ بھولو" ایک غیر مسلم کے لئے
اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ گذشتہ چند صدیوں میں
دنیائے اسلام کی جو تاریخ رہی ہے۔ اس کے لحاظ سے
مادی نقطۂ نظر کی ترقی تحقیق ذات کی ایک صورت ہے
کیا لباس کی تبدیلی یا لاطینی رسم الخط کا رواج
اسلام کے منافی ہے؟ اسلام کا بحیثیت ایک مذہب
کے کوئی وطن نہیں۔ اور بحیثیت ایک معاشرہ کے
اس کی کوئی مخصوص زبان ہے۔ اور نہ کوئی مخصوص
لباس۔ قرآن کا ترکی زبان میں پڑھا جانا تاریخ
اسلام میں کوئی نئی بات نہیں۔ اس کی چند مثالیں
موجود ہیں۔ ذاتی طور پر میں اس کو فکر و نظر کی
ایک سنگین غلطی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ عربی زبان و

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

وادب کا متعلم اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ غیر یورپی زبانوں میں اگر کسی زبان کا مستقبل ہے۔ تو وہ عربی ہے۔ بہرحال اب یہ اطلاعیں آ رہی ہیں۔ کہ ترکوں نے ملکی زبان میں قرآن کا پڑھنا ترک کر دیا ہے۔ تو کیا کثرت ازدواج کی ممانعت، یا علما پر لائسنس حاصل کرنے کی قید منافی اسلام ہے؟ فقہ اسلام کی رو سے ایک اسلامی ریاست کا امیر مجاز ہے۔ کہ شرعی "اجازتوں" کو منسوخ کر دے، بشرطیکہ اس کو یقین ہو جائے۔ کہ یہ "اجازتیں" معاشری فساد کرنے کی طرف مائل ہیں، رہا علما کا لائسنس حاصل کرنا، آج مجھے اختیار ہوتا تو یقیناً میں اسے اسلامی ہند میں نافذ کر دیتا۔ ایک اوسط مسلمان کی سادہ لوحی زیادہ تر افسانہ تراش ملا کی ایجادات کا نتیجہ ہے۔ قوم کی مذہبی زندگی سے ملاؤں کو الگ کر کے اتاترک نے وہ کام کیا۔ جس سے ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث مشکوۃ میں درج ہے۔ جس کی رو سے وعظ کرنے کا حق صرف اسلامی ریاست کے امیر یا اس کے مقرر کردہ شخص یا اشخاص کو حاصل ہے خبر نہیں اتاترک اس حدیث سے واقف ہیں یا نہیں تاہم یہ ایک حیرت انگیز بات ہے۔ کہ اس کے اسلامی ضمیر کی روشنی نے اس اہم ترین معاملہ میں اس کے میدان عمل کو کس طرح منور کر دیا ہے۔ سو یہ قانون اور اس کے قواعد وراثت کو اختیار کرنا ضرور ایک سنگین غلطی ہے۔ جو جوش اصلاح کی وجہ سے صادر ہوئی ہے۔ اور ایک ایسی قوم میں جو سرشت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ ایک حد تک قابل معافی ہے بیشتر اس کے کہ مذہب کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کی مسرت ایک قوم کو بعض اوقات ایسی راہ عمل کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ جس کا اس قوم کو کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ ترکی اور بیشتر تمام دنیائے اسلام کو اسلامی قانون وراثت کے ان مہاشی پہلوؤں کو اجلی منکشف کرنا ہے۔ جن کو فان کریمر "فقہ اسلام کی بے حد اچھی شاخ" سے تعبیر کرتا ہے۔ کیا تنسیخ خلافت یا مذہب و سلطنت کی علیحدگی منافی اسلام ہے؟ اسلام اپنی اصلی روح کے لحاظ سے شہنشاہیت نہیں ہے۔ اس خلافت کی تنسیخ میں جو بنو امیہ کے زمانہ سے عملاً ایک سلطنت بن گئی تھی اسلام کی روح اتاترک کے ذریعہ کارفرما رہی ہے۔ مسئلہ خلافت میں ترکوں کے اجتہاد کو سمجھنے کے لئے ہمیں ابن خلدون کی رہنمائی حاصل کرنی پڑے گی۔ جو اسلام کا جلیل القدر فلسفی مؤرخ اور تاریخ جدید کا ابو الآبا گذرا ہے۔ میں یہاں اپنی کتاب "اسلامی تفکر کی تشکیل جدید" کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

ابن خلدون اپنے مشہور "مقدمہ تاریخ" میں عالمگیر اسلامی خلافت سے متعلق تین متمائز نقاط نظر پیش کرتا ہے:

(۱) عالمگیر خلافت ایک مذہبی ادارہ ہے۔ اسی لئے اس کا قیام ناگزیر ہے۔

(۲) اس کا تعلق محض اقتضائے وقت سے ہے۔

(۳) ایسے ادارے کی ضرورت ہی نہیں آخر الذکر

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

خیال کو خارجیوں نے اختیار کیا تھا۔ جو اسلام کے
ابتدائی جمہوریین تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ
جدید ترکی پہلے خیال کے مقابلہ میں دوسرے
خیال کی طرف مائل ہے۔ یعنی معتزلہ کے اس خیال
کی طرف کہ عالمگیر خلافت محض اقتضائے وقت سے
تعلق رکھتی ہے۔ ترکوں کا استدلال یہ ہے۔
کہ ہمکو اپنے سیاسی تفکر میں اپنے ماضی کے
سیاسی تجربے سے مدد لینی چاہیئے جو بلاشک و
شبہ اس واقعہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ کہ
عالمگیر خلافت کا تخیل عملی صورت اختیار
کرنے سے قاصر رہا۔ یہ تخیل اسوقت قابل عمل تھا
جبکہ اسلامی ریاست برقرار تھی۔ اس ریاست کے
انتشار کے بعد سے کئی آزاد سلطنتیں وجود میں
آگئی ہیں۔ اب یہ تخیل بے اثر ہوگیا ہے اور
اسلام کی تنظیم جدید میں ایک زندگی بخش
عنصر کی حیثیت سے کارگر نہیں ہوسکتا

مذہب و سلطنت کی علیحدگی کا تصور
بھی اسلام کے لئے غیر مانوس نہیں ہے۔ امام کی
"غیبت کبریٰ" کا نظریہ ایک مفہوم میں ایک
عرصہ پہلے شیعی ایران میں اس علیحدگی کو
روبہ عمل لاچکا ہے۔ ریاست کے مذہبی و
سیاسی وظائف کی تقسیم کے اسلامی تصور کو
کلیسا اور سلطنت کی علیحدگی کے مغربی
تصور سے محفوظ نہ کرنا چاہیئے۔ اول الذکر تو
محض وظائف کی ایک قسم ہے۔ جیسا کہ اسلامی
ریاست میں شیخ الاسلام اور وزراء کے
عہدوں کے تدریجی قیام سے واضح ہوجاتا ہے
لیکن آخر الذکر روح اور مادہ کی مابعد الطبعی
ثنویت (دوئی) پر مبنی ہے۔ مسیحیت کا
آغاز ایک نظام رہبانیت سے ہوتا ہے
جسے دنیاوی امور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔
اسلام ابتدا سے ہی ایک نظام معاشری رہا ہے
جس کے قوانین بالطبع معاشری ہیں۔ اگرچہ
ان کا ماخذ الہامی ہے۔ مابعد الطبعی ثنویت نے
جس پر مذہب و سلطنت کی علیحدگی کا مغربی تصور
مبنی ہے۔ مغربی اقوام میں تلخ ثمرات پیدا کئے
کئی سال ہوئے۔ امریکہ میں ایک کتاب لکھی
گئی تھی۔ جس کا عنوان تھا۔ "اگر مسیح شکاگو
آئیں" اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک
امریکی مصنف کہتا ہے۔

مسٹر اسٹیڈ کی کتاب سے ہمیں جو سبق
حاصل کرنا ہے۔ یہ ہے۔ کہ اسوقت نوع
انسان بن برائیوں میں مبتلا ہے۔ وہ ایسی
برائیاں ہیں۔ جن کا ازالہ صرف مذہبی تاثرات
ہی کرسکتے ہیں۔ ان برائیوں کا ازالہ ایک
بڑی حد تک ریاست کے سپرد کردیا گیا تھا۔
لیکن خود ریاست فساد انگیز سیاسی مشینوں میں
دب گئی ہے۔ یہ مشین ان برائیوں کا ازالہ
کرنے کے لئے نہ صرف تیار نہیں۔ بلکہ وہ
اس قابل بھی نہیں ہیں۔ پس کروڑہا انسانوں کو

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

تباہی اور خود ریاست کو انحطاط سے بچانے
کیلئے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں۔ کہ
شہریوں میں اپنے اجتماعی فرائض کا مذہبی
احساس پیدا کیا جائے۔"

مسلمانوں کے سیاسی تجربے کی تاریخ میں مذہب و
سلطنت کی علیحدگی محض وظایف کی علیحدگی ہے
نہ کہ عقاید کی۔ اسلامی ممالک میں مذہب و سلطنت کی
علیحدگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا۔ کہ مسلمانوں کی
قانون سازی عوام کے ضمیر سے بے تعلق ہو جائے۔ جو
صدیوں سے اسلامی ہدایت کے تحت پرورش و
نمو پاتا رہا ہے۔ تجربہ خود بتلا دیگا۔ کہ یہ تخیل جدید
ترکی میں کس طرح عملی صورت اختیار کرتا ہے ہم صرف
یہ توقع رکھ سکتے ہیں۔ کہ یہ ان برائیوں کا باعث
نہ ہوگا۔ جو یورپ اور امریکہ میں پیدا ہو گئی ہیں۔

(۴) متذکرۂ صدر اصلاحات پر میں نے جو
اجمالی بحث کی ہے۔ اس میں میرا روئے سخن پنڈت
جواہر لال نہرو سے زیادہ مسلمانوں کی طرف تھا۔ پنڈت
جی نے جس اصلاح کا خاص طور پر ذکر کیا ہے وہ یہ ہے
کہ ترکوں اور ایرانیوں نے نسلی اور قومی انصب العین
اختیار کر لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ یہ خیال کرتے
ہیں۔ کہ ایسا انصب العین اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں
کہ ترکوں اور ایرانیوں نے اسلام کو ترک کر دیا ہے
تاریخ کا متعلم اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ اسلام کا ظہور
ایسے زمانہ میں ہوا۔ جب کہ وحدت انسانی کے قدیم اصول
جیسے خونی رشتہ اور ملوکیت ناکام ثابت ہو رہے تھے۔
پس اسلام نے وحدت انسانی کا اصول گوشت اور پوست میں
نہیں۔ بلکہ روح انسانی میں دریافت کیا۔ نوع انسان کو
اسلام کا اجتماعی پیام یہ ہے۔ کہ "نسل کے قیود سے
آزاد ہو جاؤ یا باہمی لڑائیوں سے ہلاک ہو جاؤ"
یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں۔ کہ اسلام فطرت کی نسل سازی کو
ٹیڑھی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اپنے مخصوص ارادوں کے
ذریعہ ایسا نقطۂ نظر پیدا کر دیتا ہے۔ جو فطرت کی
نسل ساز قوتوں کی مزاحمت کرتا ہے۔ انسانی برادری
قائم کرنے کے سلسلہ میں اسلام نے جو اہم ترین
کارنامے ایک ہزار سال میں انجام دئے ہیں۔ وہ
مسیحیت اور بدھ مت نے دو ہزار سال میں بھی انجام
نہیں دئے۔ یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں کہ
ایک ہندی مسلمان نسل اور زبان کے اختلاف کے
باوجود مراکش پہنچکر اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم
یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اسلام نسل کا سرے سے مخالف
ہے۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اسلام نے معاشری
اصلاح کو زیادہ تر اس امر پر مبنی رکھا۔ کہ بتدریج
نسلی عصبیت کو مٹایا جائے۔ اور ایسا رستہ اختیار
کیا جائے۔ جہاں تصادم کا کم سے کم امکان ہو۔
قرآن کا ارشاد ہے کہ:

"ہم نے تم کو قبیلوں میں اس لئے پیدا کیا ہے
کہ تم پہچانے جا سکو۔ لیکن تم میں سے وہی شخص
خدا کی نظر میں بہترین ہے۔ جس کی زندگی پاک ہے"
اگر اس امر کو مد نظر رکھا جائے۔ کہ مسئلہ نسل کسقدر
زبردست ہے۔ اور نوع انسان سے قطعی امتیازات
مٹانے کیلئے کسقدر وقت درکار ہے۔ تو مسئلہ نسل کے

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

متعلق صرف اسلام ہی کا نقطۂ نظر (یعنی خود ایک نسل ساز عنصر بنے کے بغیر نسلی امتیازات پر فتح پانا) معقول اور قابل عمل نظر آئیگا۔ سر آرتھر کیتھ کی چھوٹی سی کتاب "مسئلہ نسل" میں ایک دلچسپ عبارت ہے جس کا اقتباس یہاں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

اب انسان میں اس قسم کا شعور پیدا ہو رہا ہے کہ فطرت کا ابتدائی مقصد یعنی نسل سازی جدید معاشی دنیا کی ضروریات کے منافی ہے۔ اور وہ اپنے دل سے پوچھتا ہے۔ کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا نسل سازی کو ختم کر کے جس پر فطرت اب تک عمل پیرا تھی۔ دائمی امن حاصل کیا جائے؟ یا فطرت کو اجازت دیجائے کہ وہ اپنی قدیم راہ عمل اختیار کرے جس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے؟ انسان کو کوئی ایک راہ عمل اختیار کرنی پڑے گی۔ کوئی درمیانی راستہ ممکن نہیں"۔

لہذا یہ بات بالکل واضح ہے۔ کہ اگر اتاترک اتحاد تورانیت سے متاثر ہے۔ تو وہ روح اسلام کے خلاف اسقدر نہیں جا رہا ہے جسقدر کہ روح عصر کے خلاف۔ اگر وہ نسلوں کے وجود کو ضروری سمجھتا ہے۔ تو اس کو عصر جدید کی روح شکست دیدیگی کیونکہ عصر جدید کی روح بالکل روح اسلام کے مطابق ہے۔ بہرحال ذاتی طور پر میں خیال کرتا ہوں کہ اتاترک اتحاد تورانیت سے متاثر نہیں ہے۔ میرا یقین ہے۔ کہ اس کا اتحاد تورانیت ایک سیاسی جواب ہے۔ اتحاد سلاف یا اتحاد المانویہ یا اتحاد انگلو سیکسن کا۔

اگر مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ تو قومی نصب العین سے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی۔ اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموس وطن کے لئے جان تک قربان کرنے کے ہیں۔ تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اسوقت تصادم ہوتا ہے۔ جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے۔ اور اتحاد انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعوے کرتی ہے۔ اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران، مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں قومیت کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت ہے اور یہاں کی اقلیتیں جیسے یہودی، عیسائی اور زرتشتی اسلامی قانون کی رو سے یا تو اہل کتاب ہیں۔ یا اہل کتاب سے مشابہ ہیں"۔ جن سے معاشی اور ازدواجی تعلقات قائم کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے بالکل جائز ہے قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کیلئے صرف ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔ اور جہاں قومیت کا یہ تقاضا ہو۔ کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دیں جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے۔ کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے۔ جن ممالک میں مسلمان

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

اقلیت میں ہیں مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خود مختاری حاصل کیجائے حق بجانب ہوگی۔ دونوں صورتیں اسلام کے بالکل مطابق ہیں۔

سطور بالا میں دنیائے اسلام کی صحیح صورت حال کو اجمالی طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔ اگر اس کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ تو یہ امر واضح ہو جائیگا۔ کہ وحدت اسلامی کے بنیادی اصولوں کو کوئی بیرونی یا اندرونی قوت متزلزل نہیں کر سکتی۔ وحدت اسلامی جیسا کہ میں نے پہلے توضیح کی ہے۔ مشتمل ہے۔ اسلام کے دو بنیادی عقائد پر جن میں پانچ مشہور ارکان شریعت کا اضافہ کر لینا چاہیئے۔ وحدت اسلامی کے یہ اساسی عناصر ہیں۔ جو رسول کریم ؐ کے زمانہ سے اب تک قایم ہیں۔ گو حال میں بہائیوں نے ایران میں اور قادیانیوں نے ہندوستان میں ان عناصر میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہی وحدت دنیائے اسلام میں یکساں روحانی فضا پیدا کرنے کی ضامن ہے یہی وحدت اسلامی ریاستوں میں سیاسی اتحاد قایم کرنے میں سہولت پیدا کرتی ہے۔ خواہ یہ اتحاد عالمگیر ریاست (مثالی) کی صورت اختیار کرے۔ یا اسلامی ریاستوں کی ایک جمعیت کی صورت، یا متعدد آزاد ریاستوں کی صورت جن کے معاہدات اور مشاقات خالص معاشی و سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہوں گے اس طرح اس سیدھے سادھے مذہب کی تعقلی ہیئت ترکیبی رفتار زمانہ سے ایک تعلق رکھتی ہے۔ اس تعلق کی گہرائی قرآن کی چند آیتوں کی روشنی میں سمجھ میں آسکتی ہے۔ جس کی تشریح پیش نظر مقصد سے ہٹے بغیر یہاں ممکن نہیں۔ سیاسی نقطۂ نظر سے وحدت اسلامی اسوقت تک متزلزل ہو جاتی ہے۔ جبکہ اسلامی ریاستیں ایکدوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی نقطۂ نظر اسوقت متزلزل ہوتی ہے۔ جبکہ مسلمان بنیادی عقائد یا ارکان شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اس ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دایرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا۔ اسلام کے دایرے سے باہر ایسی جماعت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح رواداری برتی جا سکتی ہے میرے خیال میں اسلام اسوقت ایک عبوری دور سے گذر رہا ہے۔ وہ سیاسی وحدت کی ایک صورت سے کسی دوسری صورت کی طرف جو ابھی متعین نہیں ہوئی ہے۔ اقدام کر رہا ہے۔ دنیائے جدید میں حالات اس سرعت کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ کہ مستقبل کے متعلق پیشینگوئی تقریباً ناممکن ہے۔ اگر دنیائے اسلام سیاسی وحدت حاصل کر لے، اگر ایسا ممکن ہو تو غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے۔ جس کا جواب صرف تاریخ ہی دے سکتی ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ جغرافی حیثیت سے یورپ اور ایشیا کے درمیان واقع ہونے کے لحاظ سے اور زندگی کے مشرقی و مغربی نصب العین کے ایک امتزاج کی حیثیت سے اسلام کو مشرق و مغرب مابین ایک طرح کا نقطۂ اتصال بننا چاہیئے۔ لیکن

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

یورپ کی نادانیاں اسلام کو ناقابل مفاہمت بنا دیں۔ تو کیا ہوگا؟ یورپ کے روزمرہ حالات سے جو صورت اختیار کر رہے ہیں۔ ان کا اقتضا یہ ہے۔ کہ یورپ اپنے اس طرز عمل کو کلیتہً بدل دے۔ جو اس نے اسلام کے متعلق اختیار کیا ہے۔ ہم صرف یہ توقع کر سکتے ہیں۔ کہ سیاسی بصیرت یہ معاشی لوٹ اور شہنشاہی ہوس کا پردہ نہیں پڑیگا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ مسلمانان ہند کبھی ایسی سیاسی تصویریت کا شکار نہیں بنیں گے۔ جو انکی تہذیبی وحدت کا خاتمہ کر دے گی۔ اگر ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے۔ تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب اور حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کر لیں گے

ہز ہائینس آغا خان کے متعلق میں دو ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے لئے اس امر کا معلوم کرنا دشوار ہے۔ کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے آغا خان پر کیوں حملے کئے۔ شاید وہ خیال کرتے ہیں۔ کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زمرے میں شامل ہیں۔ وہ اس بات سے بداہتہً بے خبر ہیں۔ کہ اسماعیلیوں کی دینیاتی تاویلات کتنی ہی غلط ہوں۔ پھر بھی وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسماعیلی تسلسل امامت کے قائل ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک امام حامل وحی نہیں ہوتا۔ وہ محض قانون کا مفسر ہوتا ہے۔ یہی کافی ہی کی بات ہے۔ کہ ہز ہائینس آغا خان نے اپنے پیروؤں کو حسب ذیل الفاظ سے مخاطب کیا تھا۔

(دیکھو اسٹار آف انڈیا ۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء)

"گواہ رہو۔ کہ اللہ ایک ہے۔ اور محمد صلعم اس کے رسول ہیں۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ تم مسلمان ہو۔ اور مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ مسلمانوں سے السلام علیکم کہکر ملو۔ اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو۔ مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں باجماعت نماز پڑھو پابندی سے روزے رکھو۔ اسلامی قانون نکاح کے مطابق اپنی شادیاں کرو۔ تمام مسلمانوں سے اپنے بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو۔"

اب پنڈت جواہر لال نہرو کو اس امر کا تصفیہ کرنا چاہیئے۔ کہ آیا آغا خان اسلامی وحدت کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ یا نہیں۔

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

۷۸۶

"مملکتِ جاپان پر ایک عمرانی نظر"

ترجمہ از تبرکات مولوی ظفر علی خان ایڈیٹر اخبار زمیندار لاہور

یہ بینظیر لیکچر انگریزی زبان میں تھا۔ جو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹر ایٹ لا لاہور نے علیگڈھ کالج میں پرنسپل کے ارشاد سے ۱۹۱۱ء میں دیا۔ اس کا اردو ترجمہ جناب مولوی ظفر علی خان صاحب بی اے نے اپنے ماہواری رسالہ پنجاب ریویو میں چھاپا تھا۔ کیونکہ یہ لیکچر مصنف اور مترجم کی قابلیت کا بہترین نمونہ ہے۔ اس لئے دوبارہ شایع ہوتا ہے (مرغوب الکتبی لاہور)

انسانی تاریخ کے پارینہ اوراق کو الٹتے وقت جب ہماری نظر ارتقا کی الم ریز جدلیتوں میں سے چھنتی ہوئی ان کے رزمیہ بین السطور پر پڑتی ہے۔ تو کسی خونخوار کے گریزاں اظہاروں کی طرح ہم گذری ہوئی قوموں اور سلطنتوں اور ملتوں کے کھنڈروں کو پے بہ پے نیست سے ہست اور ہست سے نیست ہوتا دیکھتے ہیں۔ جس سے زیادہ ہیبت افزا اور حوصلہ فرسا منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ قدرت کی قوتوں کی نظروں میں نہ افراد کی وقعت ہے۔ نہ اقوام کی منزلت۔ اس کے اٹل قوانین برابر اپنا عمل کئے جا رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا اس کی منزل مقصود بہت ہی دور ہے۔ جسے مقاصد انسانی کے آغاز و انجام سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ لیکن

آدمی زادہ طرفہ معجونیست

باوجود حالات گرد و پیش کی نامساعدت کے اسکی تخیل جو عقلی کی آئینہ بردار ہے۔ اسے اپنی ہستی کا کامل تر جلوہ دکھا دیتی ہے۔ اور ان ذرائع کی دریافت پر آمادہ کرتی ہے۔ جو اس تصویر مثالی میں جس کے خط و خال اسکی نشان الکمیٹ کو چھپائے ہوئے ہیں جان ڈال سکیں دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں انسان بہت ہی کمزور و ناتوان ہے۔ اپنے بچاؤ کے لئے وہ قدرتی حربوں سے مسلح نہیں کیا گیا۔ وہ بصارت شعلہ سے محروم ہے۔ اس کی قوت شامہ اور طاقت گریز بہت کم ہے۔ لیکن پھر بھی زندگانی کی آزادیوں اور پہنائیوں کی جستجو میں اس نے اپنی ان تمام سرگرمیوں کو ہمیشہ سے وقف کئے رکھا ہے تاکہ قوانین قدرت کی کنہ اور طرز عمل سے واقف ہو کر وہ رفتہ رفتہ ان اسباب پر حاوی ہو جائے۔ جو خود اس کے ارتقا پر مؤثر ہیں۔

قانون انتخاب فطری کے اکتشاف عظیم کی بدولت انسان اپنے خانوادہ کی تاریخ کا عقلی تصور قائم کرنے کے قابل ہو گیا۔ حالانکہ پہلے اس تاریخ کے واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک حوادث کے ایک فوق الادراک سلسلہ سے زیادہ نہ تھی۔ جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا غایت کے فرداً فرداً مادر ایام کے سراپا اسرار بطن سے پیدا ہو کر گہوارہ شہود میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے۔ اس قانون کے

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

معانی کی تنقید جب اور بھی زیادہ دقت نظر سے ساتھ کی گئی اور ان فلاسفہ نے جن کی خیال آفرینیاں ڈاروں کے مقدمہ حکمت کا تتمہ ہیں۔ جب حیات کی ہیئت اجتماعی کے دوسرے نمایاں حقایق کا انکشاف کیا۔ تو مدنی زندگی کے عمرانی اخلاقی اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کے متعلق انسان کے تصورات میں انقلاب عظیم پیدا ہونے کی صورت نکل آئی۔

علم الحیات کے اصولوں نے حال میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ کہ فرد فی نفسہ ایک ہستی اعتباری ہے یا یوں کہیئے۔ کہ اس کا نام ان مجردات عقلیہ کی قبیل سے ہے جن کا حوالہ دے کر عمرانیات کے مباحث کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر فرد اس جماعت کی زندگی میں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ بمنزلہ ایک عارضی و آنی لمحہ کے ہے۔ اس کے خیالات اس کی تمنائیں اس کا طرز ماند و بود اس کے جملہ قوائے دماغی و جسمانی بلکہ اس کے ایام زندگانی کی تعداد اس جماعت کی ضروریات و حوائج کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ جس کی حیات اجتماعی کا وہ محض ایک جزوی مظہر ہے۔ فرد کے افعال کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں۔ کہ وہ بسبیل اضطرار و بلا ارادہ کسی ایک خاص کام کو جو جماعت کے نظام نے اس کے سپرد کیا ہے۔ انجام دے دیتا ہے۔ اور اس لحاظ سے اس کے مقاصد کو جماعت کے مقاصد سے تخالف کلی بلکہ تضاد مطلق ہے۔ جماعت کی زندگی بالالحاظ اپنے اجزاء ترکیبی یعنی افراد کی زندگی کے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ اور جس طرح ایک جسم ذوی الاعضا مریض ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلا علم و ارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو برانگیختہ کر دیتا ہے جو اسکی تندرستی کا موجب بن جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک قوم جو مخالف قوتوں کے اثرات سے سقیم الحال ہو گئی ہو بعض دفعہ خود بخود ردعمل کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیا کرتی ہے۔ مثلاً قوم میں کوئی زبردست دل و دماغ کا انسان پیدا ہو جاتا ہے۔ یا کوئی نئی تخییل نمودار ہوتی ہے۔ یا ایک ہمہ گیر مذہبی اصلاح کی تحریک بروئے کار آتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے۔ کہ قوم کے قوائے ذہنی و روحانی تمام طاغی و سرکش قوتوں کو اپنا مطیع و منقاد نے اور اس مواد فاسد کو خارج کر دینے سے جو قوم کے نظام جسمانی کی صحت کیلئے مضر تھا۔ قوم کو نئے سرے سے زندہ کر دیتے ہیں اور اسکی اصلی توانائی اس کے اعضا میں عود کر آتی ہے۔

اگرچہ قوم کی ذہنی و دماغی قابلیت کا دھارا افراد ہی کے دماغ میں سے ہو کر بہتا ہے۔ لیکن پھر بھی قوم کا اجتماعی نفس ناطقہ جو مدرک کلیات و جزئیات اور خبیر و مرید ہے بجائے خود ضرور موجود ہوتا ہے۔ جمہوری رائے اور قومی شطنت" وہ جملے ہیں۔ جن کی مساطت سے ہم موہوم مبہم طور پر اس نہایت ہی اہم حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ قومی ہستی ذوی العقل اور ذوی الارادہ ہے۔ اژدحام خلایق جلسہ عام۔ جماعت انتظامی۔ فرقہ مذہبی۔ فرقہ مذہبی اور مجلس مشاورت وہ مختلف ذرائع ہیں۔ جن سے قوم اپنی تدوین و تنظیم کا کام لیکر وحدت ادراک کی غایت کو حاصل کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ قومی دماغ تمام ان مختلف خیالات کی خبر یا علم رکھتا ہو۔ جو ایک وقت خاص میں افراد کے دماغوں میں موجود ہوتے ہیں

CC-0. JANGAMWADI MATH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

اس لئے کہ خود افراد کا دماغ بھی کامل طور پر اپنی ادراکی حالتوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اجتماعی یعنی قومی دماغ میں بہت سے احساسات و مقامات و تخیلات قومی حاسہ کی دسترس سے باہر رہتے ہیں۔ قوم کی ہمہ گیر و بالغ زندگی کا فقط ایک جزو محدود دروازہ کے اندر قدم رکھتا ہے۔ اور قومی ادراک کی تابناک شعاعوں سے منور ہوتا ہے۔ اس انتظام کی بدولت مرکزی اعضا کی توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار غیر ضروری جزئیات پر صرف ہونے سے محفوظ رہتی ہے

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ قوم ایک جداگانہ زندگانی رکھتی ہے یہ خیال کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں۔ کہ یہ اپنے موجودہ افراد کا محض ایک مجموعہ ہے۔ اصولاً غلط ہے۔ اور اسی لئے تمدنی و سیاسی اصلاح کی تمام وہ تجاویز جو اس مفروضہ پر مبنی ہوں۔ بہت احتیاط کے ساتھ نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھکر ہے۔ اسکی ماہیت پر اگر نظر غائر ڈالی جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ یہ غیر محدود و لامتناہی ہے۔ اس لئے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں بھی شامل ہیں۔ جو اگرچہ عمرانی حد نظر کے فوری منتہا کے پرلی طرف واقع ہیں۔ لیکن ایک زندہ جماعت کا سب سے زیادہ اہم جزو متصور ہونے کے قابل ہیں۔ علم الحیات کے اکتشافات جدیدہ نے اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا ہے کہ کامیاب حیوانی جماعتوں کا حال ہمیشہ استقبال کے تابع ہوتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو

تو اس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس کے موجودہ افراد کے مقابلہ میں شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ افراد کی فوری اغراض ان غیر محدود و نامشہود افراد کی اغراض کے تابع بلکہ ان پر نثار کردی جاتی ہیں۔ جو نسلاً بعد نسل بتدریج ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اور علم الحیات کی اس حیرت انگیز حقیقت کو وہ شخص بنگاہ استغنا نہیں دیکھ سکتا۔ جس کے پیش نظر سیاسی یا تمدنی اصلاح ہے۔ میں اپنے قوم کی موجودہ عمرانی حرکت پر اسی پہلو سے نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ یعنی اس کی تنقید استقبالی طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو اقوام کے لئے سب سے مہتم بالشان عقدہ فقط یہ عقدہ ہے۔ کہ خواہ اسکی نوعیت تمدنی قرار دی جائے۔ خواہ اقتصادی خواہ سیاسی کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے۔ مٹنے یا معدوم ہوجانے کے خیال سے قومیں بھی ویسی ہی خائف ہیں۔ جیسے افراد کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی قابلیتوں اور استعدادوں کے محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی غائت الغایات سے کرنا چاہیئے۔ ہم کو لازم ہے۔ کہ اپنے محاسن کو جانچیں اور پرکھیں اور اگر ضرورت آپڑے۔ تو نئے محاسن پیدا کریں۔ اس لئے کہ بقول نیٹشا کے کسی قوم کی بقایا کا دارومدار محاسن کی مسلسل و غیر منقسم تولید پر ہوتا ہے۔ کائنات یقیناً جناب باری کی حکمت بالغہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کا مفہوم سرتاسر انسانی ہے۔ لیکن اس تبصرہ کے آغاز سے پہلے میں

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

چند تمہیدی اُمور پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ بحث میرے نزدیک جماعت مسلمین کے متعلق کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ امور جن پر میں ترتیب وار نظر ڈالوں گا۔ حسب ذیل ہیں :-

(۱) جماعت مسلمین کی ہیئت ترکیبی۔

(۲) اسلامی تمدّن کی یکرنگی۔

(۳) اس سیرت کا نمونہ جو مسلمانوں کی قومی ہستی کے تسلسل کے لئے لازمی ہے۔

اوّلاً مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے۔ کہ قومیت کا اسلامی تصوّر دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصیل نہ اشتراک زبان نہ اشتراک وطن نہ اشتراک اغراض اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قایم فرمائی تھی۔ اس لئے شریک ہیں۔ کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں۔ وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اسکی قومیت کا دارومدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے۔ جسکی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصایل مخصوصہ شمایل مختصہ پر نہیں ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے برّا ہے۔ اسمیں شک نہیں۔ کہ قوم عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا اس کی پولیٹکل نشو و نما میں بہت بڑا حصہ لیا۔ لیکن اسلامی علوم و فنون ادب فلسفہ و حکمت کے انمول موتیوں کے رولنے کا کام اور یہ وہ کام ہے جو نفس ناطقہ انسانی کی اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے۔ زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ اسلام کا ظہور قوم عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزدان طلبی کی ایک آنی و عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چمک تھی۔ یا شرار کا تبسم تھا لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کا جولانگاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔ پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خاص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے۔ لہذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسی اصیل مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جایز تصور کرے۔ قومیت کا ملکی تصور جس پر زمانہ حال میں بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے ہیں۔ اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ قومیت کے جدید تصور نے چھوٹے چھوٹے پولیٹکل حلقے قایم کرکے اور اُن میں نقابت کی اس صحیح القوام عنصر کو پھیلا کر جس تمدن جدید کی شاخ میں بوقلمونی کا پیوند لگایا ہے۔ دنیا کو تھوڑا بہت فایدہ ضرور پہنچایا ہے۔ لیکن بڑی خرابی اس تصور میں یہ ہے۔ کہ اس میں غلو اور افراط کا شاخسانہ نکل آتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی تنیوں کی نسبت غلط فہمی پھیلا رکھی ہے۔ اس لئے پولیٹکل سازشوں اور منصوبہ بازیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس نے فنون لطیفہ و علوم ادبیہ کو خاص خاص قوموں کی خصوصیات کی میراث قرار دے کر عام انسانی عنصر کو اس میں سے نکالدیا ہے میں سمجھتا ہوں

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust.

کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرح سے ایک بادی شے کا تالیہ ہے۔ جو سراسر اصول اسلام کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرک خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لئے مودار ہوا تھا۔ لیکن اس سے یہ نہ گمان کیا جائے۔ کہ میں جذبہ حب وطن کا سرے سے مخالف ہوں۔ اُن قوموں کیلئے جنکا اتحاد حدود ارضی پر مبنی ہو۔ اس جذبہ سے متاثر ہونا ہر طرح سے حق بجانب ہے۔ لیکن میں اُن لوگوں کے طرز عمل کا یقیناً مخالف ہوں۔ جو اس امر کے معترف ہونے کے باوجود کہ جذبۂ حب وطن قومی سیرت کا ایک قیمتی عنصر ہے۔ ہم مسلمانوں کی عصبیت کو نام دھرتے ہیں۔ اور اسے وحشیانہ تعصب کہکر پکارتے ہیں۔ حالانکہ ہماری عصبیت ایسی ہی حق بجانب ہے۔ جیسی انکی وطن پرستی۔ عصبیت سے بجز اس کے اور کچھ مراد نہیں کہ اصول جب نفس بجائے اس کے کہ ایک فرد واحد میں ساری دوائر ہو۔ ایک جماعت پر اپنا عمل کرتا ہے۔ حیوانات کی تمام نوعیں کم و بیش ضرور متعصب ہوتی ہیں۔ اور اگر انہیں اپنی انفرادی یا اجتماعی ہستی برقرار رکھنی ہے۔ تو ضرور ہے۔ کہ ان میں عصبیت موجود ہو۔ اقوام عالم پر نظر ڈالیئے۔ ایک قوم بھی ایسی نہ ہوگی جو پیرایۂ عصبیت سے عاری ہو۔ کسی فرانسیسی کے مذہب نکتہ چینی کیجئے۔ وہ بہت ہی کم متاثر ہوگا۔ اس لئے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مس نہیں کیا۔ جو اسکی قومیت کی روح رواں ہے۔ لیکن ذرا اس کے تمدن اس کے ملک یا پولیٹکل سرگرمیوں کے کسی شعبہ کے متعلق اُس کی قوم کے مجموعی طرز عمل یا شعار پر تو خردہ گیری کر دیکھئے پھر اس کی جبلّی عصبیت کا شعلہ بھڑک اُٹھے۔ تو ہم جانیں بات یہ ہے۔ کہ فرانسیسی کی قومیت کا انحصار اس کے معتقدات مذہبی پر نہیں ہے۔ بلکہ جغرافی حدود یعنی اس کے ملک پر ہے۔ پس جب آپ اُس خاص خطۂ زمین پر جسے اس نے اپنے تخیل میں اپنی قومیت کا اصلی اصول قرار دے رکھا ہے۔ معترض ہوتے ہیں۔ تو آپ اس کی عصبیت کو واجبی طور پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت ایک شے معنوی الذہن ہے۔ موجود فی الخارج نہیں ہے۔ بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آکر جمع ہو سکتے ہیں۔ وہ مظاہر آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا اشراقی سمجھوتا ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے۔ پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو بُرا کہنا ہماری آتش عصبیت کو برافروختہ کرتا ہے۔ تو میری دانست میں یہ برافروختگی اس فرانسیسی کے غصہ سے کچھ کم واجبی نہیں ہے۔ جو اپنے وطن کی برائیاں سُنکر بھڑک اٹھتا ہے۔ عصبیت سے صرف قومی یا سیاسی مراد ہے۔ دوسری اقوام کو بنگاہ تنفر دیکھنا اس کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ زمانہ قیام انگلستان جب کبھی مجھے کسی خاص مشرقی رسم یا طرز خیال کو کسی انگلش لیڈی یا جنٹلمین کے سامنے بیان کرنیکا اتفاق ہوا۔ تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس پر اظہار تعجب نہ کیا گیا ہو۔ جس سے مجھے رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ کہ ان لوگوں کے نزدیک ہر غیر انگلش خیال گویا داخل عجائبات قدرت ہے۔ مجھے انگریزی قوم کا یہ وطیرہ

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

نہایت ہی پسند ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے۔ کہ یہ
قوم پیرایہ تخیلیں سے عاری ہے۔ جس خاک سے شیکسپیر
شیلی کیٹس۔ ٹینی سن اور سو نبرن پیدا ہوئے ہوں
وہ بھلا خیال آفرینیوں اور ذہانت آرائیوں سے کیونکر
معرا ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ بات ہمیں ماننی پڑتی ہے۔
کہ انگلستان کا طریقہ ماندہ بود و دارد خورد و فکر یہاں کے
آئین و قوانین اور اس کے رسم و رواج اس ملک کے
رہنے والوں کی زندگی کے لائحہ عمل کے لئے لابنفک بن گئی ہیں

غرض مذہبی خیال بنا اس دینی اکتناز کے جو
افراد کی آزادی میں غیر ضروری طور پر خلل انداز ہو
اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا مدار علیہ ہے۔
آگسٹس اکونٹ کا قول ہے۔ کہ "چونکہ مذہب ہماری
کل ہستی پر حاوی ہے۔ لہذا اس کی تاریخ ہماری نشو و
نما کی پوری تاریخ کا خلاصہ ہونی چاہیئے"۔ یہ قول جیسا
ہماری قوم پر صادق آتا ہے۔ ویسا کسی اور قوم پر
نہیں آتا۔ لیکن یہ سوال یہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ اگر
اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا انتہائی مدار علیہ
محض چند معتقدات ہیں۔ جن کی نوعیت مابعد
الطبیعی ہے۔ تو کیا یہ بنیاد نہایت ہی متزلزل نہیں ہے؟
خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ علوم جدیدہ تیز یا ترقی
کر رہے ہیں۔ اور ہر بات کے حسن و قبح کو پرکھنا اور
معقولات اور منطقی استدلال سے قدم قدم پر کام
لینا ان علوم کا لازمہ قرار دیا گیا ہے۔ مشہور فرانسیسی
مستشرق رنیان کا یہی خیال تھا۔ اور دبے الفاظ میں
اس نے یہ امید ظاہر کی تھی۔ کہ اسلام ایک دن دنیا کے
ایک بڑے حصے کی عقلی و اخلاقی پیشوائی کے منصب
اعلیٰ سے گر جائیگا۔ جن اقوام کی اجتماعی زندگی کا
اصل اصول حدود اراضی سے وابستہ ہوا نہیں
معقولات سے خائف نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن ہمارے حق میں
یہ ایک خطرناک دشمن ہے۔ اس لئے کہ یہ اسی اصول کو
مٹانا چاہتا ہے۔ جس پر ہماری قومی ہستی مبنی ہے اور
جس نے ہماری اجتماعی وجود کو قابل فہم بنا رکھا ہے۔
تعقل در اصل تخریبی ہے۔ اور اسی لئے معقولات سے
اس قومی شیرازہ کے بکھر جانے کا اندیشہ ہے۔ جو مذہبی
قوت کا باندھا ہوا ہے۔ اگرچہ اسمیں شک نہیں۔ کہ
ہم معقولات کا توڑ عقلی حربوں سے کر سکتے ہیں۔ لیکن میں
جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ
اعتقاد یعنی ہمہ گیر وفاق کا وہ نکتہ جس پر ہماری جماعت کی
وحدت منحصر ہے۔ ہمارے لئے اپنے مفہوم کے لحاظ سے
عقلی نہیں بلکہ قومی ہے۔ مذہب کو فلسفہ نظری
بنانے کی کوشش کرنا۔ میری رائے میں بے سود محض
بلکہ لغو و مہمل ہے۔ اس لئے کہ مذہب کا مقصد یہ نہیں ہے
کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے
بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے۔ کہ زندگی کی سطح کو بتدریج
بلند کرنے کے لئے ایک مربوط و متناسب عملی نظام
قائم کیا جائے۔ مذہب سیرت انسانی کا ایک نیا اسلوب
یا نمونہ پیدا کرکے اس شخص کے اثر کے لحاظ سے جو
اس سیرت کا مظہر ہے۔ اس نمونہ کو دنیا میں پھیلانا
چاہتا ہے۔ اور اس طور پر چونکہ وہ ایک نئی دنیا کو
خلق کرتا ہے۔ لہذا اس پر مابعد الطبیعیات کا

CC-0. JNU. CH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

اطلاق ہوتا ہے۔ میری مُراد اُن تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں۔ کہ وہ ایک مذہب ہے۔ بلکہ اس سے بہت بڑھکر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔ اور ہماری قومی زندگی کا تصور اُس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا۔ جبتک کہ ہم اصول اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر اسلامی تصوّر ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے۔ جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے۔ وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا

ثانیاً۔

معتقدات مذہبی کی وحدت جس پر ہماری قومی زندگی کا دارومدار ہے۔ اگر مضاف سے تعبیر کی جائے تو اسلامی تہذیب کی یکرنگی بمنزلہ اس کے مضاف الیہ کے ہے۔ محض اسلام پر ایمان لے آنا اگرچہ نہایت ہی ضروری ہے۔ لیکن کافی و مکتفی نہیں ہے۔ قومی ہستی میں شریک ہونے کی غرض سے ہر فرد کے لئے قلب ماہیت لازمی ہے۔ اور اس قلب ماہیت کے لئے خارجی طور پر تو ارکان و قوانین اسلام کی پابندی کرنی چاہیئے۔ اور اندرونی طور پر اس یکرنگ تہذیب و شائستگی سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ جو ہمارے آباو اجداد کی متفقہ عقلی تحریک کا ماحصل ہے۔ اسلامی جماعت کی تاریخ پر جسقدر زیادہ غور کیا جائیگا۔ اسی قدر یہ تاریخ حیرت انگیز و تعجب خیز نظر آئیگی۔ اُس دن سے جبکہ اسلام کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ سولھویں صدی کے آغاز تک یعنی تقریباً ایک ہزار سال کا زمانہ اس بے چین قوم نے ملک گیریوں اور جہاں کشائیوں میں صرف کیا۔ اگرچہ اس ہمہ گیر مشغلہ میں منہمک ہونے کے باعث انہیں کسی دوسرے شغل کی فرصت نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی اسلامی دنیا نے علم و حکمت کے قدیم خزانوں کو ڈھونڈ نکالا۔ اور ان پر اپنی طرف سے معتدبہ اضافہ کر کے ایک عدیم النظیر لٹریچر کا سرمایہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور اس کے علاوہ ایک ایسے جامع مانع نظام فقہ کو مدون کیا۔ جو اسلامی تمدن کا غالباً سب سے زیادہ گرانمایہ ترکہ ہے جس طرح جماعت مسلمین اُن اختلافات کو جن کی بنا رنگ و خون پر ہو تسلیم نہیں کرتی۔ اور دنیا کی تمام نسلوں کو انسانیت کے ہمہ گیر خیال کی مسلک میں منسلک کرنا اپنی غایت سمجھے ہوئے ہے۔ اسطرح مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی کا معیار بھی عالمگیر ہے اور ان کا وجود اور نشو و نما کسی ایک قوم خاص کی دماغی قابلیتوں کا مرہون منّت نہیں ہے۔ البتہ ایران اس تہذیب و شائستگی کی نشو و نما کا جزو اعظم قرار پا سکتا ہے۔ اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے۔ کہ تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ اہم واقعہ کونسا ہے۔ تو میں بلا تامل اس کا یہ جواب دونگا۔ کہ فتح ایران۔ معرکہ نہاوند نے عربوں کو نہ صرف وسیع زرخیز زمین کا مالک بنا دیا۔ بلکہ ایک قدیم قوم پر مسلط کر دیا۔ جو سامی اور آریہ مسالے سے

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

ایک نئے تمدن کا محل تعمیر کرنے کی قابلیت رکھتی تھی ہمارا اسلامی تمدن سامی تفکر اور آریہ تخیل کے اختلاط کا حاصل ہے۔ جب ہم اس کے خصائل و شمائل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسکی نزاکت اور دلربائی اسے اپنی آریہ ماں کے بطن سے اور اس کا وقار و متانت اسے اپنے سامی باپ کے صلب سے ترکہ میں ملا ہے۔ فتح ایران کی بدولت مسلمانوں کو وہی گرانمایہ متاع ہاتھ آئی — جو تسخیر یونان کے باعث اہل روما کے حصہ میں آئی تھی۔ اگر ایران نہ ہوتا۔ تو ہمارے تمدن کی تصویر بالکل ایک رخی ہوتی۔

یہاں ضمناً اس امر کا ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ وہ قوم جس کے اختلاط نے عربوں اور مغلوں کی مشکل ہی بدل دی۔ عقل و ادراک کے لحاظ سے مردہ نہیں ہے۔ ایران جس کی پولیٹیکل آزادی کو روس کی غاصبانہ آرزوؤں نے معرض خطر میں ڈال رکھا ہے۔ ابھی تک اسلامی تہذیب کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اور ہم لوگوں کی دلی تمنا ہے۔ کہ اسلامی دنیا میں اس کا وہ درجہ جواب تک قائم رہتا چلا آیا ہے۔ بدستور قائم رہے۔ ایران کے شاہی خاندان کیلئے ایران کی پولیٹیکل آزادی کا فقدان فقط اس کا ہم معنی ہوگا۔ کہ زمین کا ایک ٹکڑا اس کے قبضہ سے نکل گیا۔ لیکن اسلامی تہذیب کے لئے یہ واقعہ تیرھویں صدی کی تاتاری حملہ سے بھی زیادہ بلا خیز و مصیبت انگیز ہوگا۔ بہرحال یہ ایک پولیٹیکل بحث ہے۔ جسمیں میں اسوقت نہیں پڑنا چاہتا۔ میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ جماعت سامیین کا زندہ رکن بننے کے لئے ان

مذہب اسلام پر بلا شرط ایمان لانے کے علاوہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں اپنے تئیں پوری طرح سے رنگنا چاہئے "صبغۃ اللہ" کے اس خم میں غوطہ لگانے کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان دو رنگی چھوڑ کر یکرنگ ہو جائیں۔ ان کا ذہنی منظر ایک ہو۔ ہر ماہر آرڈینیش پر ایک خاص پہلو سے نظر ڈالیں۔ اشیاء کی ماہیت اور قدر و قیمت کو اس انداز خاص کے ساتھ جانچیں۔ جو جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کا مابہ الامتیاز ہے۔ اور جو مسلمانوں کو ایک غائیت مخصوصہ و مقصد معینہ کے پیرایہ سے آراستہ کر کے انہیں کل مؤمن اخوۃ کی کتاب کے اوراق بنا دیتا ہے۔

ثالثاً۔ شق ثانی کے تحت میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس سے واضح ہو گیا ہوگا — کہ اسلامی سیرت کے نمونے کی نمایاں خصوصیات کیا کیا ہونی چاہئیں۔ لیکن یہ جتا دینا ضروری ہے۔ کہ سیرت کے وہ مختلف نمونے جنہیں ایک قوم پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بخت و اتفاق کی کورانہ قوتوں کا حاصل نہیں ہیں۔ زمانہ حال کا علم عمرانیات ہمیں یہ نکتہ سکھاتا ہے۔ کہ قوموں کا اخلاقی تجربہ خاص خاص قوانین معینہ کا تابع ہوا کرتا ہے۔ زمانہ قبل تاریخ میں جبکہ زندہ رہنے کے لئے انسان کو سخت جد و جہد کرنی پڑتی تھی۔ اور دماغی قابلیتوں کے مقابلہ میں وہ جسمانی قوتوں سے زیادہ کام لیتا تھا۔ تو اسی شخص کی سب تعریف و تقلید کرتے تھے۔ جو شجاع ہوتا تھا۔ جب جہد البقا کی کشمکش فرو ہوئی اور خطرہ زائل ہو گیا۔

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust.

تو دورِ شجاعت گیا۔ اور باصطلاح گڈ بکس دورِ مروّت آیا جس میں جرأت و دلاوری اگرچہ پھر بھی مستحسن سمجھی جاتی تھی۔ لیکن انسانی سیرت کا ہر دلعزیز اور عام پسند نمونہ وہ شخص متصور ہوتا تھا۔ جو نشاطِ عمر کی ہر صنف کا رسیا ہو۔ اور قیاضی و ایثار اور ہم نوالگی اور ہم پیالگی کے گوناگون اوصاف سے متصف ہو۔ لیکن چونکہ ان دونوں اسالیب کا میلان غلو و افراط کی جانب تھا۔ لہٰذا ان کے عمل کا ردِ عمل ایک تیسرے نمونہ یا اسلوب نے کیا جس کی غائت الغایت ضبطِ نفس ہے۔ اور جو زندگی پر زیادہ متانت و تقشف کے ساتھ نظر ڈالتا ہے ہندوستان میں جب ہم اسلامی جماعت کے ارتقا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں تیمور اسلوب اول کا مظہر نظر آتا ہے۔ بابر اسالیب اول و دوم کے امتزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ جہانگیر اسلوب ثانی کے سانچے میں خصوصیت کے ساتھ ڈھلا ہوا ہے۔ اور عالمگیر جس کی زندگی اور کارنامے میری دانست میں ہندوستان کی اسلامی قومیت کی نشوونما کا نقطۂ آغاز ہیں۔ اسلوب ثالث کا چہرہ کشا ہے۔ اُن لوگوں کے نزدیک جنہوں نے عالمگیر کے حالات تاریخ ہند کے مغربی شارحین کی زبانی سنے ہیں۔ عالمگیر کا نام سفاکی و فسادت جبر و استبداد۔ مکاری و غداری اور پولیٹیکل سازشوں اور منصوبوں کے وابستہ ہے۔ خلط مبحث کا خوف مانع ہے۔ ورنہ میں معاصرانہ تاریخ کے واقعات کی صحیح تعبیر و تفسیر سے ثابت کرتا۔ کہ عالمگیر کی پولیٹیکل زندگی کی وجود تحریک ہمارے جاہد حق بجانب تھے۔ تھیں۔ اس کے حالاتِ زندگی اور اس کے عہد کے واقعات کا بنظرِ انتقاد مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین واثق ہو گیا ہے کہ جو الزامات اس پر لگائے جاتے ہیں۔ وہ واقعات متعاصرہ کی غلط تعبیر اور اُن تمدنی و سیاسی قوتوں کی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ جو ان دنوں سلطنت اسلام کے طول و عرض میں عمل کر رہی تھیں۔ میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے بھٹیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے۔ اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے۔ کہ اس نمونہ کو ترقی دیجائے۔ اور مسلمان ہر وقت اسے پیش نظر رکھیں

اگر ہمارا مقصد یہ ہو۔ کہ ہماری قومی ہستی کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہ آئے۔ تو ہمیں ایسا اسلوب سیرت تیار کرنا چاہیئے۔ جو اپنی خصوصیات مختصہ سے کسی صورت میں بھی علیحدگی اختیار نہ کرے۔ اور حسنُ ما صَفا دَعْ ما کَدَرْ کے زرین اصول کو پیشِ نظر رکھکر دوسرے اسالیب کی خوبیوں کو اخذ کرتے ہوئے اُن تمام عناصر کی آمیزش سے اپنے وجود کو کمال احتیاط کے ساتھ پاک کر دے۔ جو اس کی روایات مسلمہ و قوانین منضبط کے منافی ہوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی عمرانی رفتار کو نگاہِ غور سے دیکھنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ جو قوم کے اخلاقی تجربہ کے مختلف خطوط کا نقطۂ اتصال ہے۔ پنجاب میں اسلامی سیرت کا بھٹیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں بوجہ اس خفیف سے اختلاف کے جو وہاں کے عقلی حوالی میں

CC-0. Mumukshu Bhawan Varanasi Collection. Digitized by eGangotri

ساری دوائیں ہے۔ اس اسلوب سیرت کی ضرورت کا اعلان ایک شاعر کی زیر دست تخیل نے بلند آہنگی کے ساتھ کیا ہے جناب مولانا ئے اکبر الہ آبادی جنہیں موزوں طور پر لسان العصر کا خطاب دیا گیا ہے۔ اپنے بذلہ سنجانہ پیرایہ میں ان قوتوں کی ماہیت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں جو آجکل مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں۔ ان کے کلام کے ظریفانہ لہجہ پر نہ جائیے۔ ان کے شباب اور قہقہے ان کے آنسوں کے پردہ دار ہیں۔ وہ اپنے نہاں خانہ صنعت میں اسوقت تک آپکو دخل ہونیکی اجازت نہیں دیتے۔ جبتک کہ آپ ان کا مال خریدنے کیلئے دوق سلیم کے دام اپنی جیب میں ڈالکر نہ آئیں۔ غرض اس جماعت میں جس کے اجزائے ترکیبی کی نوعیت احد ہو خیالات و جذبات کا تعلق یہاں تک گہرا ہوتا ہے کہ اگر اس جماعت کے ایک حصے کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے تو اس خواہش کے پورا کرنے کا سامان یک بیک دوسرا حصہ پیدا کر دیتا ہے۔

اب میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ اسوقت تک جو بحث میں نے کی ہے۔ اس میں ذیل کی تین حقیقتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۔ مذہبی خیال اسلامی جماعت کا سرچشمۂ زندگانی ہے اس جماعت کی صحت و توانائی کے قایم رکھنے کے لئے ان مخالف قوتوں کی نشو و نما کو جو اس کے اندر کام کر رہی ہیں۔ بغور دیکھتے رہنا چاہیئے۔ اور خارجی عناصر کی صریح آمیزش سے اول تو بچانا اور یا اگر آمیزش منظور ہی ہو۔ تو اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ آمیزش آہستہ آہستہ اور بتدریج ہو تاکہ نظام مدنی کی قوت آخذہ اور جاذبہ پر زیادہ زور نہ پڑے۔ اور اس طور پر یہ نظام بالکل ہی درہم و برہم نہ ہو جائے۔

۲۔ جماعت اسلامی سے جس فرد کو تعلق ہو۔ اس کا ذہنی سرمایہ اس دولت سے ماخوذ ہونا چاہیئے جو اس کے آباد اجداد کی دماغ کی قابلیتوں کا حاصل ہے تاکہ وہ ماضی و استقبال کے ربط مسلسل کو محسوس کرتا رہے۔

۳۔ اس کے خصائل و شمایل اس خاص اسلوب سیرت کے مطابق ہوں جس کو میں نے اسلامی اسلوب سے تعبیر کیا ہے۔

اب میں تمدن کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے قومی کارناموں کی قدر و قیمت کا جایزہ لیتا ہوں۔ اسلامی دنیا نے جہانبانی۔ مذہب۔ ادب۔ حکمت۔ درس و تدریس۔ دقایع نگاری۔ صنعت و حرفت اور تجارت کی اصناف میں جو جو کام کیا ہے۔ اس کی مبسوط تنقید کئی ضخیم جلدوں کی محتاج ہوگی۔ عالم اسلام میں جو واقعات اسوقت پیش آرہے ہیں وہ نہایت ہی معنی خیز ہیں۔ اور ان پر تفحص کی نگاہ ڈالنا بہت کچھ سبق آموز ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کام بے حد محنت طلب ہے۔ اور میں اسکی انجام دہی سے ہوں۔ اس لئے میرا تبصرہ فقط مسلمانان ہند کے کارناموں سے متعلق ہوگا۔ اگرچہ اس موضوع پر بھی ان مختلف مسایل کی نسبت جو ہمیں درپیش ہیں۔ میں شرح و

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

بسط کے ساتھ رائے زنی نہ کر سکوں گا۔ میں صرف دو امور سے بحث کروں گا:۔

(۱) تعلیم اور

(۲) عامۂ خلائق کی عام حالت کی اصلاح:۔

گذشتہ پچاس کے دوران میں مسئلہ تعلیم ہماری ہمتوں اور سرگرمیوں کا نصب العین بنا رہا ہے یہ سوال کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ آیا اشاعت تعلیم میں ہم نے کسی خاص غایت کو پیش نظر رکھا ہے۔ یا استقبال کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو کر محض حال ہی کی فوری اغراض کا لحاظ کیا ہے؟ ہم نے کس قسم کے تعلیم یافتہ اشخاص تیار کئے ہیں؟ آیا ان اشخاص کی قابلیت ایسی ہے۔ کہ ہم مسلمانوں کی سی مختلف التراکیب جماعت کی عمرانی ہستی کے تسلسل کی کفیل ہو سکے؟ ان سوالات کے جوابات کئی بار پہلے ہی دئے جا چکے ہیں۔ علم النفس کے اصول سے جو لوگ واقف ہیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ نفس ناطقہ کی وہ کیفیت جسے استبصار یا ہوشیاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ ذہنی حالتوں کے باقاعدہ تواتر پر منحصر ہوتی ہے۔ جب نفس ناطقہ کے سلسلۂ ہشیاری میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ تو نفس بیمار پڑ جاتا ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ قوائے حیوانی رفتہ رفتہ تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت اقوام کے نفس ناطقہ کی ہے جس کا تسلسل اس اجتماعی تجربہ کے باقاعدہ انتقال پر ہے۔ جو نسلاً بعد نسل قوم کو اپنے اسلاف سے میراث پہنچا رہتا ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اس توارث متوالیہ کی مؤید ہو کر نفس ناطقہ قومی کو استبصار کا اہل بنائے۔ تاکہ وہ اپنی ذات کے ادراک پر قادر ہو سکے۔ فرد کا رابطۂ اتحاد اس قوم کے ساتھ جس کا وہ جزو ہے۔ اگر پڑھ سکتا ہے۔ تو اسی دانستہ کوشش سے تعلیم کے ذریعہ سے روایات مجتمعہ کے جو مختلف اجزاء اس طور پر منتقل کئے جاتے ہیں۔ وہ نفس ناطقہ قومی میں جذب اور پیوست ہو کر ان چند افراد قوم کے لئے میل و فرسنگ کا کام دیتے ہیں۔ جنکی پوری زندگی اور کل قابلیت غور و فکر قوم کے مختلف غایات و مقاصد کی منزلیں طے کرنے میں گذر جاتی ہے۔ مثلاً ایک قوم کی قانونی، تاریخی اور علمی روایات اس قوم کے مقننوں مؤرخوں اور انشا پردازوں کی چشم بصیرت کے سامنے ہر وقت ایک نمایاں شکل میں موجود رہتے ہیں۔ اگرچہ قوم کو مجموعی حیثیت سے ان روایات کا ادراک موہوم و مبہم طور پر ہوتا ہے۔ اس نقطۂ خیال سے اگر ہم اپنے تعلیمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا حامل ہے۔ جسکی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے۔ حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ اور میں علی الرغم اس کا شہادت کہتا ہوں۔ کہ اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لیبل چسپاں

CC-0. IKM ACU Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

نشہ میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے
ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے
بلا خوف تردید میرا یہ دعوے ہے۔ کہ دنیا کی کسی قوم نے
ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا
نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے لیکن بایں ہمہ ہمارے
نوجوان کو جو اپنی قوم کی سو سالہ تاریخ عمری سے بالکل نابلد ہے
مغربی تاریخ کے مشاہیر سے "استحسانا" و "استہداءً"
رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقلی و ادراکی لحاظ سے وہ مغربی
دنیا کا غلام ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اس کی روح
اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے
جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا
ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی جد و جہد میں اس حقیقت پر
جس کا اعتراف تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے۔ نظر نہیں
ڈالی۔ کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احدی اپنا
ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا
حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ یہ حلقہ بگوشی ہے۔ جس کے
نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے
بڑھکر خطرناک ہیں۔ کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو
مولانا اکبر سے زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کیا۔ جو
نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک
نظر غایر ڈالنے کے بعد حسرت آگین لہجہ میں پکار
اُٹھتے ہیں ؎

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کنایہ ہے۔ ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے

اُس قدامت انتساب نام لیوا سے جو مغربی تعلیم کے بارہ میں
سر سید احمد خان مرحوم کے ساتھ مدت العمر الجھا جھگڑا کیا۔
آج ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ بیچارے شیخ کا خوف
بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے۔
کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے
اس پر ہماری تعلیم کا حاصل زندہ گواہ ہے مجھے امید ہے
کہ ان کڑوی کسیلی باتوں کے سننے والے مجھے معاف
فرمائیں گے۔ آج کل کی طالب العلمانہ زندگی سے چونکہ
گذشتہ دس بارہ سال کی مدت میں مجھے سابقہ پڑتا رہا ہے
اور میں ایک ایسے مضمون کا درس دیتا رہا ہوں جسکو
مذہب سے قریبی کا تعلق ہے لہذا میں اس بات کا تھوڑا
بہت استحقاق رکھتا ہوں۔ کہ میری باتیں سنی جائیں
مجھے یہ کڑوا تجربہ بتجربہ ہوا ہے۔ کہ مسلمان طالب العلم
جو اپنی قوم کے عمرانی اخلاقی اور سیاسی تصورات سے
نابلد ہے۔ روحانی طور پر بمنزلہ ایک بیجان لاش کے ہے
اور اگر موجودہ صورت حالات اور بیس سال تک قایم رہی
تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علمبرداروں
کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہماری
جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائیگی۔ وہ لوگ
جنھوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قایم کیا تھا۔ کہ
ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز کلام مجید کی تعلیم سے
ہونا چاہیئے۔ وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی اہلیت سے
زیادہ باخبر تھے۔

ہماری قومی سرگرمیوں کی محرک اقتصادی اغراض
ہی نہیں ہونی چاہئیں۔ قوم کی وحدت کی بقا اور

CC-0. In Public Domain. Panini Kanya Maha Vidyalaya Collection. Digitized by eGangotri

اس کی زندگی کا تسلسل قومی آرزؤں کا ایک ایسا نصب العین ہے۔ جو فوری اغراض کی تکمیل کے مقابلہ میں بہت زیادہ اشرف و اعلیٰ ہے۔ ایک قلیل البضاعت مسلمان جو سینہ میں ایک درد بھرا اسلامی دل رکھتا ہو۔ میری رائے میں قوم کے لئے بمقابلہ اس پیش قرار تنخواہ یا نیو آلے آزاد خیال گریجویٹ کے زیادہ سرمایۂ نازش ہے جسکی نظروں میں اسلام اصول زندگی نہیں ہے۔ بلکہ محض ایک آلہ جلب منفعت ہے۔ جس کے ذریعے سے بڑے بڑے سرکاری عہدے زیادہ تعداد میں حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ میری ان باتوں سے یہ خیال نہ کیا جائے۔ کہ میں مغربی تہذیب کا مخالف ہوں۔ اسلامی تاریخ کے ہر مبصر کو لامحالہ اس امر کا اعتراف کرنا پڑیگا۔ کہ ہمارے عقلی و ادراکی گہوارے کو جھلانے کی خدمت مغرب نے ہی انجام دی ہے۔ فلسفیانہ تخییل کی سرزمین میں شاید ابھی تک بجائے عربی یا ایرانی ہونے کے زیادہ تر یونانی نظر آرہے ہیں۔ بایں ہمہ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا۔ کہ خود ہماری خالص اسلامی تہذیب اپنی مثال آپ ہے اور تعلیم کا کوئی جدید اسلامی نظام متعلمین کی قومیت پر حرف لائے۔ بغیر اس کو انداز نہیں کرسکتا اسلامی یونیورسٹی کے خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں ایک مبارک علامت ہے۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو اس قسم کے دارالعلم کی ضرورت میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی۔ بشرطیکہ یہ دارالعلم ٹھیٹھ اسلامی اصول پر چلایا جائے۔ کوئی قوم اُس رشتہ کو یک بیک نہیں توڑ سکتی۔ جو اسے اُس کے ایام گذشتہ سے جوڑے ہوئے ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے۔ جن کی مجموعی روایات ان کی قومیت کی جان ہیں مسلمان کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز یا رفتار کے قدم بقدم چلنا چاہیئے۔ لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تعلیم کا رنگ خالص اسلامی ہو۔ اور یہ اسوقت تک نہیں ہوسکتا۔ جب تک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو۔ جسے ہم اپنی قومی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں۔ ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آب حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں۔ اور اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ایک ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں۔ جو بوجہ کسی اکتسابی یا اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھیگا۔ اور گرد و پیش کی ان قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائیگا۔ جس میں اس کی نسبت زیادہ قوت و جان ہوگی۔

لیکن ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قایم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے کون نہیں جانتا۔ کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علماء اور واعظ انجام دے رہے ہیں۔ جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

تاریخ اور اسلامی علوم کی متعلق نہایت ہی محدود ہے
اخلاق اور مذہب کے اصول و فروع کی تلقین کے لئے
موجودہ زمانہ کے واعظ کو تاریخ اقتصادیات اور عمرانیات
کے حقایق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی
قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی
چاہئیے۔ الندوہ۔ علیگڈھ کالج مدرسہ دیوبند
اور اسی قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام
کر رہے ہیں۔ اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے
ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند
ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دار العلم ہونا چاہیئے
جہاں افراد قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو و نما
دینے کا موقع حاصل کر سکیں۔ بلکہ تہذیب کا وہ
اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے۔ جس میں زمانۂ
موجودہ کے ہندوستانی مسلمان کو ڈھلنا چاہیئے
پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے۔ کہ ایک نیا مثالی
دار العلم قایم کیا جائے۔ جس کی مسند نشین اسلامی
تہذیب ہو۔ اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب
دلکش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر مثالی
کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے اعلیٰ تخیل
زمانہ کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کو
تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے:۔

اس بحث کے خاتمہ سے پہلے میں مسلمان
عورتوں کی تعلیم کے متعلق چند کلمات کہنا ضروری سمجھتا
ہوں۔ اسلام میں عورتوں کا جو درجہ ہے۔ اس تفصیلی
رائے زنی کرنے کی یہاں گنجایش نہیں ہے۔ البتہ کھلے
لفظوں میں اس امر کا اعتراف میں ضرور کرونگا۔ کہ
بفحوائے آیۂ کریمہ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ
میں مرد اور عورت کی مساوات مطلق کا حامی نہیں ہو سکتا
یہ ظاہر ہے۔ کہ قدرت نے ان دونوں کے تفویض جدا
جدا خدمتیں کی ہیں۔ اور ان فرایض جداگانہ کی صحیح
اور باقاعدہ انجام دہی خانوادۂ انسانی کی صحت اور
فلاح کے لئے لازمی ہے۔ مغربی دنیا میں جہاں نفسی
نفسی کا ہنگامہ گرم ہے۔ اور غیر معتدل مسابقت نے
ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے
عورتوں کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے۔ جو
میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا
نقصان رساں ثابت ہوگا۔ اور نظام معاشرت میں
اس سے بیحد پیچیدگیاں واقع ہو جائینگی۔ اور
عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے بھی جس حد تک کہ افراد
قوم کی شرح ولادت کو تعلق ہے۔ جو نتائج مترتب
ہونگے۔ وہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہونگے۔ مغربی
دنیا میں جب عورتوں نے گھر کی چار دیواری سے باہر
نکلکر کسب معاش کی جد و جہد میں مردوں کا ساتھ دینا
شروع کیا۔ تو خیال یہ کیا جاتا تھا۔ کہ ان کی یہ اقتصادی
حریت دولت کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ کرے گی
لیکن تجربہ نے اس خیال کی نفی کر دی۔ اور ثابت کر دیا
کہ خاندانی وحدت کے رشتہ کو جو بنی نوع انسان کی
روحانی زندگی کا جزو اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے۔
میں اس حقیقت کے اعتراف کے لئے آمادہ ہوں
کہ زمانۂ حال میں کسی جماعت کا محض مقامی قوتوں کے ذریعے

CC-0. NMACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

پانا محال ہے۔ ریل و تار نے زمان اور مکان کے پردہ کو درمیان سے اُٹھا دیا ہے۔ اور دُنیا کی مختلف قومیں جن میں پہلے بُعد المشرقین حایل تھا۔ اب پہلو بہ پہلو بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس ہمنشینی کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ بعض قوموں کی حالت بدلکر رہ جائیگی۔ اور بعض قومیں بالکل ہی ملیامیٹ ہو جائینگی۔ جو عظیم الشان اقتصادی عمرانی اور سیاسی قوتیں اسوقت دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں۔ اُن کے نتائج کے بارہ میں کوئی شخص پیش بندی کی راہ سے رائے زنی نہیں کر سکتا لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ گو کسی قوم کیلئے بغرض تکمیل صحت اپنی تمدنی آب و ہوا کی تبدیل کے طور پر کسی غیر قوم کے تمدن کے عناصر کا اخذ و جذب۔ کبھی قرین مصلحت بلکہ لازمی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر اختیار کی تقلید میں شتاب زدگی اور بے سلیقگی سے کام لیا گیا۔ تو نظام قومی کے اعضائے رئیسہ میں اختلال عظیم کے پیدا ہونے کا خطرہ ہوگا۔ اقوام کے تمدن میں ایک پہلو عمومیت کا ہوا کرتا ہے۔ لیکن ان کی معاشرت کی رسموں اور سیاسی دستوروں میں خصوصیت شخصی کی شان نظر آتی ہے۔ یہ رسوم اور دستورات ان قوموں کی تاریخی زندگی اور ان کی خاص روایات سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ پس اپنی قوم کی خاص نوعیت اسلام کی تعلیم اور عالم نسوان کے متعلق علم الاعضاء و علم الحیات کے اکتشافات کو مدنظر رکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ مسلمان عورت کو جماعت اسلامی میں بدستور اسی حد کے اندر رہنا چاہیئے۔ جو اسلام نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے اور جو حد کہ اس کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ اسی کے لحاظ سے اس کی تعلیم ہونی چاہیئے:۔

میں نے سطور بالا میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ ہماری جماعت کا شیرازہ اُسی وقت تک بندھا رہ سکتا ہے۔ جب تک کہ مذہب اسلام اور تہذیب اسلام کو ہم پر قابو ہے۔ چونکہ عورت کے دماغ کو مذہبی تخیل کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔ لہذا قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لئے یہ بات نہایت ہی ضروری ہے۔ کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں۔ تو انکو اسلامی تاریخ۔ علم تدبیر خانہ داری اور علم اصول حفظ صحت پڑھایا جائے۔ اس سے ان کی دماغی قابلیتیں اس حد تک نشو و نما پا جائینگی۔ کہ وہ اپنے شوہروں سے تبادلہ خیالات کر سکیں گی۔ اور امومت کے وہ فرایض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گی۔ جو میرے رائے میں عورت کے فرایض اولین ہیں۔ تمام وہ مضامین جو ان کی نسائیت کی نفی کرنے یا اسلام کی حلقہ بگوشی سے انہیں آزاد کرنے والے ہوں۔ باحتیاط ان کے نصاب تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں۔ لیکن ہمارے نکتہ آموز ابھی تک اندھیرے میں رہتے ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک مدارس نسواں کیلئے کوئی خاص نصاب تعلیم معین و مرتب نہیں کیا۔ اور ان میں سے بعض ہزہ گو اردو کی آنکھیں ہو مغربی تصورات کی

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

روشنی سے ایسی چندھیا گئی ہیں۔ کہ وہ ابھی تک اسلام میں جو قومیت کو ایک خاص ذہنی کیفیت یعنی مذہب پر منحصر قرار دیتا ہے۔ اور مغربیت میں جس نے قومیت کا محل ایک خارجی مراد یعنی وطن کی بنیاد پر تعمیر کیا ہے کوئی فرق نہیں سمجھ سکے۔

اب میں چند خیالات اپنی قوم کے غربا کی عام حالت کی اصلاح کے متعلق ظاہر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں عام طبقہ کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت سب سے پہلے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا۔ کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابل رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزو غالب مسلمان ہیں۔ معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اجرت، غلیظ مکان اور ان کے پیٹ کی روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرتناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا ہے؟ لاہور کے مسلمانی محلہ میں جانکلو ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی جس کے وحشت ناک سکوت کے طلسم کو پارہ پارہ کرتا ہوا غریب نیم برہنہ بچوں کی چیخ پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی۔ جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کیلئے پھیلی ہوئی ہونگی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جاکر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں ڈالا نہیں گیا۔ لیکن غیرت خودداری اجازت نہیں دیتی۔ کہ خیرات کیلئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ ہمارے نوجوان علمبرداران اصلاح تمدن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قوا کے روز افزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں۔ شاید یہ نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمہ دار پردہ نہیں۔ بلکہ یہ جان ذیسا افلاس ہے۔ جو ہماری قوم کے ادانی و اقاصی کو کھائے جا رہا ہے۔ علاوہ اس افلاس زدہ طبقہ کے ایک اور طبقہ ان نکمے اور نکھٹو افراد کا ہے جو اپنے جیسی ناکارہ اولاد پیدا کر کے سستی و کاہلی اور بداعمالی و سیہ کاری کی زندگی خود بھی بسر کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی اپنا سا بنا دیتے ہیں۔ کیا ہم نے تمدنی عقدہ کے ان پہلوؤں پر بھی کبھی نظر ڈالی ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس بات کو محسوس کیا ہے۔ کہ ہماری انجمنوں اور مجلسوں کا فرض یہ نہیں ہے۔ کہ خاص خاص اشخاص کی کلاہ اعزاز و افتخار میں بیٹھے ہوئے طرّے لگایا کریں۔ بلکہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی سطح کو اونچا کریں؟ سب سے زیادہ اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے۔ یہ ہے کہ کیونکر اپنے قوم کی اقتصادی حالت کو نظر غایر ڈالکر ان اسباب کا پتہ لگائے۔ جنہوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے۔ اس کا یہ فرض ہے۔ کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی اس حالت میں کس حد تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں۔ کس حد تک

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

اہل ملک کی تاریخی روایات، عادات، آداب اور اخلاقی کمزوریوں نے حصہ لیا۔ اور اگر گورنمنٹ کے دخل و عمل کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے۔ تو وہ کس حد تک ہے؟ جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑا اٹھائے۔ اُسے چاہیئے۔ کہ مذہب و ملت کے اختلاف کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو جائے۔ اور کسی ایک جماعت کی طرفداری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس بھٹکنے نہ دے۔ اس لئے کہ اقتصادی قوانین تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں۔ شرح مالگذاری کا آئے دن کا اضافہ۔ مسکوکات ممالک غیر کی اس ملک میں درآمد۔ قیمت اجناس کی گرانی (خواہ اس گرانی کا باعث یہ ہو کہ سکہ رائج الوقت کے متعلق حکومت کے قائم کئے ہوئے اصول غلط ہیں۔ یا یہ کہ ایک زراعتی ملک اور ایک صنعتی ملک کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ قائم کر دیا گیا ہے یا کوئی اور سبب ہو) یہ تمام امور ایسے ہیں۔ جو مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور پارسیوں کی اقتصادی حالت پر یکساں مؤثر ہو کر نہایت بلند آہنگی سے منادی کر رہے ہیں۔ کہ مختلف جماعتوں کے اہل الرائے اور مقتدا اگر اور باتوں میں نہیں تو اقتصادیات میں تو ضرور آپس میں سر جوڑ کر مشورہ کر سکتے ہیں۔ اور ملک کی مشترکہ فلاح کی تدابیر پر غور کر سکتے ہیں۔ لیکن مسلمان پیشوایان قوم نے اب تک اپنی تمام توجہ اس مسئلہ پر صرف کئے رکھی ہے۔ کہ سرکاری نوکریاں ہم لوگوں کو بحصہ رسدی ملتی رہیں۔ یہ کوشش بجائے خود ضرور قابل ستائش ہے۔ اور تاوقتیکہ مسلمانوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو۔ ہمارے سربرآوردگان ملت کو برابر اس کوشش میں سرگرمی کے ساتھ مصروف رہنا چاہیئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی انہیں مدنظر رکھنی چاہیئے۔ کہ دولت کی پیداوار کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے سرکاری ملازمت ایک نہایت ہی محدود ذریعہ ہے۔ سرکاری ملازمت معدودے چند اشخاص کو ضرور آسودہ خوشحال بنا دیتی ہے لیکن قوم کے تمام افراد اسی صورت میں آسودہ خوشحال ہو سکتے ہیں۔ جبکہ ان کو اقتصادی آزادی نصیب ہو۔ اس میں بھی شک نہیں۔ کہ اگر کسی قوم کے چند افراد حکومت کے اعلیٰ مناصب فائز ہوں۔ تو اس قوم کی عزت اور خودداری میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ اقتصادی سرگرمی کے اور بہت سے اصناف ایسے ہیں۔ جو اہمیت اور سعادتمندی میں سرکاری ملازمت کے لگ بھگ ہیں۔ جس قوم کو اپنے اسلاف سے سپاہیانہ روایات ترکہ میں پہنچی ہوں۔ اس کے لئے سپہگری کے تصورات کو چھوڑ کر تجارت اور صنعت و حرفت کی ڈگر پر پڑ لینا یقیناً تکلیف دہ ہے۔ لیکن چونکہ مغربی اقوام کی دیکھا دیکھی ایشیا کی تمام قوموں کی اقتصادی حالت تغیر پذیر ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ کودوں تو دلنی کی پڑے گی۔ علاوہ ان اقتصادی مشکلات کے رفع کرنے کے جو ہماری سنگ راہ ہیں

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

ہمیں صنعتی تعلیم پر بھی ضرور اپنی توجہ صرف کرنی چاہئے
جو میری رائے میں اعلےٰ تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے
صنعتی تعلیم سے عامۂ خلائق کی اقتصادی حالت سدھرتی
ہے۔ اور یہی طبقہ قوم کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے
ہے بخلاف اس کے اعلیٰ تعلیم صرف ان چند افراد کو
نفع پہنچاتی ہے۔ جن کی دماغی قابلیت درجۂ اوسط
سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہمارے اغنیا کے بذل و
جود کا مصرف ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ عام مسلمانوں کے
بچے ارزاں صنعتی تعلیم حاصل کر سکیں۔ لیکن صنعتی
اور تجارتی تعلیم بلا کسی اخلاقی تربیت کے بجائے خود
کافی و مکتفی نہیں ہے۔ اقتصادی مقابلہ میں
تربیت، کے اخلاقی عنصر کی بھی ضرورت نہیں پڑتی

بقیہ گذارش

بقول اور نگ زیب دوبارہ سر ابھارنے کی کوئی صورت باقی نہ رکھی
اللہ اپنی بیشمار نوازشوں سے جناب سلام الدین صاحب سلمہ کو تادیر
اور سید آدت پناہ جناب سید غلام احمد صاحب منطقی قادری سجادہ
نشین و متولی زیارت ہائے اولیاء اللہ بابا صاحب کو نوازے
جن سے یہ دو بیش بہا خزینے ملے۔ اور اب انکی دولت حکمت
بضوائے الحکمۃ ضالۃ المؤمن حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے
اور بمال غنیمت تارین مومنین کے لوٹے جانے کے لئے
پیش کیا جاتا ہے:۔

حضرت اقبال کے ان دو مقالوں پر مشتمل الاولیاء تمام
جرائد و رسائل کے خاص نمبروں کے اوپر آگیا۔ اور انکی اشاعت
سے اسلام اور مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اور اہم خدمت محبان
اولیاء کی جمعیت نے انجام دی۔ اللھم اجعل سعینا مشکورا

اعتماد باہمی۔ دیانتداری۔ پابندی اوقات اور تعاون
وہ اقتصادی اوصاف ہیں۔ جو مہارت فن کی برابر کی
جوڑ ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے کارخانے محض
اس لئے نہ چل سکے۔ کہ کارخانہ داروں کو نہ ایکدوسرے
پر بھروسہ تھا اور نہ اصول امداد باہمی ان کا رہنما تھا
اگر ہم اچھے کاریگر اچھے دوکاندار اچھے اہل حرفہ
اور سب سے بڑھکر یہ کہ اچھے شہری پیدا کرنا
چاہتے ہیں۔ تو ہمیں چاہیئے۔ کہ انہیں اول پکا
مسلمان بنائیں

اس خصوصی اقبال نمبر کی ضخامت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس لئے
اسکی قیمت دو روپیہ رکھی گئی ہے۔ یوں بھی تو ہم حضرت اقبال کی
عقیدتمندی اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی محبت میں خریدار نا خریدار
قارئین نیز تمام مسلمانوں سے نذرانہ نقدی کی توقع رکھتے ہیں۔
تاکہ اس اشاعت پر جو خرچہ آیا ہے وہ پورا ہو جائے۔ اگر صاحب کے
بارے میں ہم اپنی تقریروں اور تحریروں میں بار بار تذکرہ عرض
کر چکا ہوں۔ کہ حضرت اقبال کا کلام سراسر تفسیر قرآن و تعبیر سنت
و تشہیر اسلام ہے۔ اس لئے انکی کتابیں ہمارا قومی دینی و دنیوی
تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی سرمایہ ہیں۔ انکے کلام کا ایک ایک حرف
ہر فرد مومن کے پاس بطور تبرک "ہدایۃ عمل" موجود ہونا
چاہیئے۔ اس لئے یہ دو مقالے بھی جو ہم "الاولیاء" کے
اس نمبر میں شائع کر رہے ہیں۔ اور ہر گھر میں پہنچنے چاہئیں
اس خاص نمبر کے بعد اولیاء کی جو اشاعت ہوگی
وہ حسب معمول اپنی طرز پر ہوگی۔ ان میں دینیات مقالات
بدستور درج ہونگے۔ اس لئے جنکے مقالات اس اشاعت میں

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

یہ

غلوِ عقیدت ہے یا شعورِ حقیقت

کہ

حضرت مولانا رومیؒ نے برملا اقبال کا راز بتایا ہے

(مفتی جلال الدین)

سال ۱۹۷۳ء کے ستمبر یا اکتوبر میں میرے ہمسایہ تعلیمی ادارہ ملی پریزہائی سکول باغ دلاور خان میں حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں اور اس شاعر ترجمان حقیقت کو عقیدت و خلوص محبت کے نذرانے پیش کئے جانے کی غرض سے ایک خاص تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مٹر گشتی کی جو دھن سمائی۔ مجھے اسی طرف لے گئی۔ میں نے کوئی دو سو افراد کا مجمع دیکھا اور جناب سید حسین صاحب صدر ریجیلیٹو کونسل کو زمام بخش جلسہ پایا۔ مقررین اقبالیات کے مختلف موضوعات و عنوانات پر بول رہے تھے۔ یہ تو میرے لئے گویا من بھاتا کھانا تھا۔ اور طبعی ہمیلان فطری جذبہ کی چیز۔ اس لیے چپکے سے ایک کرسی سنبھالی۔ اور تقریروں کے مزے لینے لگا۔ اتنے میں صاحب صدر کی نظر نے تاک لیا اور میں تاڑ گیا۔ کہ میری شامت آگئی۔ یعنی تقریر کی فرمایش ہونے لگی۔ نہیں۔ تقاضا پہ تقاضا اور اصرار پہ اصرار آنے لگے۔ کہ کچھ تو کہیئے۔ لوگ کہتے ہیں۔ آج غالب غزل سرا نہ ہوا۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ قضائے مبرم ٹل سکیگا۔ لیکن یہ تقاضائے مبرم اٹل ہے۔ اس لئے اپنی شومئی قسمت اور مٹر گشتی کو دل ہی دل میں صلواتیں سناتے ہوئے میک پہ آ ہی گیا :۔

اقبالیات کے تنوع میں ایسا کھو گیا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ فی البدیہہ اقبال پر کیا کہوں کیسے کہوں۔ اور اس ستم ظریفی کا کیسے جواب دوں۔ آخر پیر رومی اور اقبال کا عنوان ذہن میں آیا۔ جس پہ ایک دفعہ کئی سال پہلے مجاہد منزل کے ہال میں غیر متوقع گرفت میں جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب کی صدارت میں بولا تھا اور شاید اس طرح بے جوڑ بولا تھا۔ کہ محسوس کیا ہوگا۔ اپنی تقریر میں

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہاں یاد ہے کہ یہ تو بلند بانگ کہہ ڈالا۔ کہ اقبال پیر رومی کے ذریعہ ہی شاعر قرآن بنا ہے جلسہ زیر ذکر میں یہ بتایا۔ کہ مجاہد منزل کی اس تقریب کے دن سے اس آج کے جلسہ تک اقبال اور رومی کا لازم و ملزوم ہونے کا عقیدہ بہت گہرا

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

راسخ ہو چکا ہے۔ اور میں نے اس کو اپنے غور و فکر
اور اپنے مطالعہ اور اپنی تحقیقات کا خاص موضوع بنایا ہے
اس لئے ان دونوں کی باہمی نسبت کو اچھی طرح
سمجھنے کے لئے مثنوی کا مطالعہ اقبالیات کی روشنی
میں اور اقبالیات کا مطالعہ مثنوی کی روشنی میں
کر رہا ہوں۔ دفتر اوّل کے پیر چنگی کی داستان کے
مطالعہ کے دوران مجھے ایسا لگا ہے۔ کہ حضرت مولانا
رومی رح نے اقبال کا ذکر کیا ہے اور اس کا راز بھی
بتایا ہے۔ آج میں اس اجلاس میں پہلی بار اس
مضحکہ خیز یا تعجب انگیز یا ناقابل باور
عقیدہ کا اعلان کرتا ہوں۔ اقبال اور راز اقبال کا
ذکر مثنوی میں یوں وارد ہے ؎

پیش من بنشین و مہجوری مساز
تا بگویشت گویم از اقبال راز

درشکار پیشۂ جان باز باش
ہمچو خورشید جہاں جانباز باش
ہر زمان از غیب نو نو میرسد
از جہان تن برون شو میرسد
"بارہا گفتہ ام از گفتۂ خود دلشادم"
(حافظ)

یہ بات میں نے برملا کہی۔ اور بار بار کہی۔
کلچرل اکیڈمی کے اقبال سیمنار میں گذشتہ
سال کے ماہ مارچ میں مختلف یونیورسٹیوں سے
آئے ہوئے بڑے بڑے قوی ہیکل علم و فضیلت والوں کے
سامنے چھوٹا منہ اور بڑی بات کے مصداق میں کہی ہے
اور گذشتہ نومبر میں کشمیر یونیورسٹی کے منعقدہ
سیمنار میں بھی اپنے مقالہ میں لکھکر پڑھکر سنائی
نہ معلوم یہ غلو عقیدت ہے یا شعور حقیقت؟

مقام اقبال رح

شیخ التبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رح کا ایک کشف مدیہ بران علامہ مولانا سعید اکبر آبادی

حضرت اقبال رح کے مزار پر

۲۳ مارچ ۱۹۷۷ء علامہ اقبال کے مزار پر حاضر
ہوا۔ اور معلوم نہیں کیوں مزار پر نگاہ پڑھتے ہی دل میں
ایک ہول اٹھی۔ اور آنسو نکل پڑے۔ یہاں ایک واقعہ
یاد آیا۔ کاندہلہ ضلع مظفر نگر میں ایک صاحب تھے جن کا نام
ظہیر الحسن تھا۔ یہ کاندہلہ کے بڑے رئیس نہایت دیندار
اور مخیر ہونے کے ساتھ نہایت قابل اور بڑے فاضل بھی تھے

علیگڈھ سے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا تھا۔ مطالعہ کے بڑے
ذہنی تھے ۱۹۴۷ء میں آزادی ملے ہوئے چند روز ہی
ہوئے تھے کہ ایکدن مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے
نکل کر گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ کہ کسی بدبخت نے
ان پر گولی چلادی اور وہ شہید ہو گئے۔ ہم ارکان
ندوۃ المصنفین سے ان کے نہایت مخلصانہ اور برادرانہ

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

مراسم تھے۔ ان مولوی ظہیر الحسن صاحب شہید نے خود مجھ سے بیان کیا۔ کہ ایکمرتبہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی (جو مولوی صاحب کے رشتہ میں ماموں یا چچا بھی ہوتے تھے) کاندھلہ تشریف لائے۔ تو اپنے گھر جانے کے بجائے میرے مکان پر قیام فرمایا۔ شب میں مولانا سو رہے تھے۔ میری چارپائی قریب ہی تھی۔ ایک دو بجے کا عمل ہوگا۔ کہ مولانا پر کشف کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ اچانک اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور آواز دے کر مجھے بھی اٹھا دیا۔ پھر فرمایا۔ میاں ظہیر الحسن تمہیں معلوم ہے۔ کہ اقبال کا مرتبہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا۔ حضرت! میں ایک بندۂ عاصی و خاطی! ان امورِ غیبی کی نسبت کیا کہہ سکتا ہوں اس پر فرمایا۔ اقبال نے وفات سے چند روز پہلے حضرت جل شانہٗ کو مخاطب کرکے یہ رباعی کہی تھی ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
گر حسابم را بگیری نا گزیر
از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

اس رباعی میں آخری مصرعہ اقبال نے کس سوز و گداز قلب سے کہا ہے۔ کہ رحمتِ خداوندی کو جوش آگیا۔ اور اس نے اپنی آغوش میں لے لئے اقبال کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ

فارسی شاعری میں جامی، رومی، خاقانی عرفی اور قدسی ایسے نہایت عظیم الشان اور بلند پایہ نعت گو شعرا پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن نعت گوئی میں اقبال کے تیور اور کچھ ہیں۔ ایک نظم میں اقبال عالمِ خیال میں حج کو جاتے ہیں۔ جب حج سے فارغ ہو کر مکہ سے مدینہ طیبہ جانے لگتے ہیں۔ تو حضرت حق جل شانہٗ کو از راہ شوخی خطاب کرکے کہتے ہیں

تو باش اینجا و با خاصان بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

یعنی! اچھا اے خدا! تو اپنے خاص بندوں کے ساتھ یہاں رہ۔ میں تو منزلِ دوست پر پہنچنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ یہاں دوسرے مصرعہ سے عشقِ نبویؐ اور روضۂ اقدس پر جلد جلد پہنچنے کی تمنا کے باعث اقبال کے دل کی بے قراری و بے چینی کے جو شرارے نکل رہے ہیں۔ وہ ایک مسلمان کے ایمان کا متاع گرانمایہ ہیں۔ جس طرح ایک بچہ باپ کی گود میں ہوتا ہے۔ تو کبھی کبھی پیار میں باپ کی داڑھی پکڑ لیتا اور اس کے چہرہ کو ننھے منے ہاتھوں سے تھپ تھپانے لگتا ہے۔ اور باپ اس پر برا نہیں مانتا۔ بلکہ خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض صوفیاں نے اپنے اشعار میں خدا کے ساتھ شوخ کلامی کی ہے اور یہ رنگ اقبال کے ہاں بھی ہے۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ کسی نے یہ شوخ کلامی کبھی نہیں کی۔ اور آپ کے ساتھ عشق و محبت کے اظہار میں بھی آپ کا حد درجہ ادب اور احترام ملحوظ رکھا ہے۔ اسی لئے عارفانہ ہدایت ہے ؎

با خدا دیوانہ باش و با مصطفیٰؐ ہشیار باش

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

یہاں خاموشی تھی آدمی بھی کم تھے۔ اس لئے مزار پر آنکھ بند کر کے بیٹھ گیا۔ اور فاتحہ پڑھنے لگا۔ اسوقت میری چشم تصور نے کیا دیکھا؟ وہ کسی کو سنانے کی چیز نہیں ہے۔

فریادِ اُمّت

"فریادِ امت" اور "نالۂ یتیم" علامہ اقبال رح کے ابتدائی دور کی طویل نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں علم و حکمت اور ہدایت و نور کا ایک سرمدی چشمہ ہیں۔ فصاحت و بلاغت کا زندہ جاوید اعجاز ہے۔ اسلوب بیان کا جو نمونہ شیرازہ اختیار کیا گیا ہے۔ وہ نہایت سادہ اور آسان ہے یہ دونوں نظمیں اقبال کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ امت مرحومہ کو سوز و گداز اور فکر و معنی کی دعوت دیتا ہے یہ نظمیں حسن بیان اور طرز ادا اور اثر آفرینی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اقبال رح کی ان نظموں کو صرف پہلی مرتبہ طبع کیا گیا ہے۔ اور اب بازار میں نایاب ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان نظموں کو بالاقساط رسالہ "الاولیاء" کی زینت کا سامان بنائیں۔ تاکہ عوام و خواص علامہ اقبال کے دل کی دھڑکنوں کو سن سکیں۔ جن میں ادبی حقیقتیں ہیں۔ اور قدیم و جدید تاریخ فلسفہ اسلام کا نچوڑ بھی۔

(مقتبس)

دل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اُسے لاؤں کیونکر
ہو چھپانے کی نہ جو بات چھپاؤں کیونکر

شوقِ نظارہ یہ کہتا ہے قیامت آئے
پھر میں نالوں سے قیامت نہ اٹھاؤں کیونکر

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ
پھر تیری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیونکر

صدمۂ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ!
یہ بھی اک ناز ہے تیرا نہ اٹھاؤں کیونکر

زندگی تجھ سے ہے اے نارِ سبب اے میری!
اشکِ غم سے ترے شعلوں کو بجھاؤں کیونکر

تجھ میں سو نغمے ہیں اے تارِ ربابِ ہستی!
زخمۂ عشق سے تجھ کو نہ بجاؤں کیونکر

ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی مجھ کو
ہائے اس دردِ محبت کو چھپاؤں کیونکر

بات ہے راز کی پر منہ سے نکل جائیگی
یہ مئے کہنہ خم دل سے اُچھل جائیگی

آسمان مجھ کو بجھا دے جو فروزاں ہوں میں
صورتِ شمع سرِ گورِ غریباں ہوں میں

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

ہوں وہ بیمار جو ہو فکرِ مداوا مجھ کو
درد چپکے سے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں

دیکھنا! تو میری صورت پہ نہ جانا گلچیں!
دیکھنے کو صفتِ نرگسِ خنداں ہوں میں

موت سمجھا ہوں مگر زندگیٔ فانی کو
نام آ جائے جو اس کا تو گریزاں ہوں میں

دور رہتا ہوں کسی بزم سے اور جیتا ہوں
یہ بھی جینا ہے کوئی جس سے پشیماں ہوں میں

کنجِ عزلت سے مجھے عشق نے کھینچا آخر
یہ وہی چیز ہے جس چیز پہ نازاں ہوں میں

داغِ دل مہر کی صورت ہے نمایاں لیکن
ہے اسے شوق ابھی اور نمایاں ہوں میں

ضبط کی جا کے سنا اور کسی کو ناصح!
اشک بڑھ بڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں ہوں میں

ہوں رقم مضمونِ کرشمہ سمجھ اے میرا
کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں

رند کہتا ہے دلی مجھ کو، دلی رند مجھے
ہے کہاں دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں

ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب ہے کہ نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں

دیکھ اے چشمِ عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جن پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

مزرعِ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
دردِ قربان ہو جس دل پہ وہ ہے دل میرا

قصۂ دارورسن بازیٔ طفلانۂ دل
التجائے ادبی سرخیٔ افسانۂ دل

یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی؟
جادۂ راہِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل

از رحمت ہو اگر تہمتِ عشق
جل گئی مزرعِ ہستی تو اگادانۂ دل

حسن کر ترا نہ یہ مجھ
تو نے فریاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

عرش کا ہے کبھی کعبہ کبھی
کس کی منزل ہے الٰہی! ترا کاشانۂ دل

کچھ اسی کو ہے دھریں
جو ہوا قیدیٔ زنجیرِ پریخانۂ دل

اس کو اپنا ہے جنوں اور
دل کسی اور کا دیوانہ ہیں دیوانۂ دل

تو سمجھتا نہیں اے زاہد
رشک بجا ہے اک اقلیمِ مستانۂ دل

ہے کیا جانے اس گھر
ہوا جو منصور سے دیوانہ فرزانۂ دل

(باقی آئندہ)

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust

CC-0. INTACH Kashmir. Digitized by eGangotri Trust